www.shibliinternational.com
January 2019

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad

Vol-1, Issue-11

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد حامد ہلال اعظمی

10/- روپے

جنوری Jan :2019

علمی، ادبی، سائنسی، مذہبی، سماجی اور معلوماتی شاہکار

جلد:1 Vol:1 - شمارہ:11 Issue:11

ماہنامہ

حیدرآباد

صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری، ڈاکٹر عبدالقدوس، ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی
پروفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی
پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،
ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ
محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال
ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سید امام
حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ
ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان، ڈاکٹر فضیل احمد ندوی،
ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

قیمت فی شمارہ: 15
سالانہ: 150 - بیرونی ممالک: 50/ امریکی ڈالر
خصوصی تعاون: 1000

MOHD MUHAMID HILAL
A/c: 52023475202
Ifsc: SBIN0020413
Micr: 500002311 Branch: Dabeerpura Hyd

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی باتیں	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	عباداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ (قسط: ۸)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۸
۴	مدارس کا تعلیمی منظر نامہ	مفتی امانت علی قاسمی	۱۱
۵	غزل	ڈاکٹر رحیم رامش	۱۵
۶	منصور ہند صوفی سرمد شہید۔۔۔کتاب زیست کے چند گم شدہ اوراق	مولانا افتخار رحمانی	۱۶
۷	2 Rukh رخ	ڈاکٹر سراج احمد انصاری	۲۰
۸	غزل	ساغر اعظمی	۲۱
۹	ریاستِ مدینہ کا آئین اور اسلامی شہریت کی بنیادیں	احمد نور عینی	۲۲
۱۰	مجروح سلطان پوری ایک غزل گو شاعر	آصفیہ شمیم	۲۵
۱۱	غزل	صفی الرحمٰن صفی	۲۷
۱۲	تذکرہ: آزادئ ہند کے ایک گمنام مجاہد کا	شفیق الرحمٰن صدیقی	۳۰
۱۳	کرنے کا کام: ابدی عذاب سے بچنے کی کوشش کرنا ہے	مولوی حبیب الرحمٰن	۳۳
۱۴	غزل	نثار نامی	۳۴
۱۵	مولانا محمد محسن صاحب کی وفات کا سانحہ	مولانا بدر الحسن قاسمی	۳۵
۱۶	حضرت مولانا حافظ میر شجاع الدین حسینی قادریؒ	حکیم سید شاہ محمد خیر الدین قادری، صوفی	۳۸
۱۷	میلبورن میں ٹیم انڈیا نے مارا میدان	ابو ہریرہ ایوبی	۳۹
۱۸	جذباتِ نامی (شعری مجموعہ)	مبصر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۴۱

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی...... الحاج **محمد منیر الدین عرف ولی**، آغا پورہ حیدرآباد
ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد...... الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ولیج سکندرآباد حیدرآباد
علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر)...... **علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)
الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ولیج سکندرآباد حیدرآباد...... **محمد عبد الماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد
جناب قاضی **فیض الدین**، ایرتوڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ الحاج **محمد حبیب** صاحب، کوسم عابڈس حیدرآباد
ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد...... مولانا **محمد عبد القادر سعود**
نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔ الحاج **محمد قمر الدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

اداریہ

اپنی باتیں

۲۰۱۹ء کی آمد آمد ہے۔ نئے سال کی مبارکبادیوں کا سلسلہ جاری وساری ہے، مگر ہمیں یہ ضرور سوچنا چاہئے کہ ہم نے گذشتہ سال میں کیا پایا؟ کیا کھویا؟۔ کیونکہ جو قوم اپنا احتساب کرتی ہے، وہی زندہ قوم کہلاتی ہے اور جس نے اپنا محاسبہ کرنا چھوڑ دیا ہے، وہ مثل لاشہ ہے ؎

احساس کے انداز بدل جاتے ہیں ورنہ
دامن بھی اسی تار سے بنتا ہے کفن بھی

ہم بڑے جوش وخروش کے ساتھ ہر سال ۲۶؍جنوری کو یوم جمہوریہ مناتے ہیں۔ کیونکہ اسی دن ہندستان کا آئین نافذ العمل ہوا تھا۔ آئین ہند کی تمہیدی باتیں کچھ اس طرح ہیں۔

''ہم بھارت کے عوام متانت وسنجیدگی سے عزم کرتے ہیں کہ بھارت کو ایک مقتدر سماج وادی، غیر مذہبی، عوامی جمہوریہ بنائیں اور اس کے تمام شہریوں کے لیے حاصل کریں:

انصاف، سماجی، معاشی اور سیاسی: آزادیٔ خیال، اظہار، عقیدہ، دین اور عبادت، مساوات بہ اعتبار حیثیت اور موقع اور ان سب میں اخوت کو ترقی دیں، جس سے فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور سالمیت کا تیقن ہو''۔ (بھارت کا آئین، ص:۳۵)

بالا تمہیدی پیراگراف بار بار پڑھیں اور ملک کی موجودہ صورت حال پر نگاہ ڈالیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو لوگ قانون پر چلنے کی قسم کھاتے ہیں، وہی زیادہ قانون شکنی کرتے ہیں اور ان کو اتنا بھی احساس نہیں ہوتا ہے کہ وہ قسم کا کفارہ ہی ادا کردیں۔ کیا کرنا چاہئے اور کیا کررہے ہیں۔

۲۰۱۸ء میں طلاق کا لفظ ایوانوں، اخباروں اور ٹیلی ویژن پر اس قدر بولا اور لکھا گیا کہ اس کی مثال ماضی قریب اور بعید میں نہیں ملتی، حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ معمہ خواہ مخواہ نظر آتا ہے، کیونکہ یہ مسلمانوں کا اندرونی اور مذہبی معاملہ ہے۔ چند سو، یا ہزار کی خواہش پر کروڑوں کو تکلیف دینا جمہوری ملک میں آئین واخلاق کے قتل کرنے کے مترادف ہے۔

طلاق ثلاثہ بل پر جو لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں بحثیں ہوئیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جمہوری ہندستان کا ضمیر باقی ہے، کیونکہ اس بل کے خلاف ایوان میں معزز اراکین خواتین وحضرات نے جو تقریریں کیں اور یہ ثابت کیا کہ اس بل کے ذریعہ انصاف نہیں کیا جاسکتا، بلکہ دھوکہ دیا جارہا ہے۔

صدائے شبلی کا تازہ شمارہ اور سبھی شمارے ہماری ویب سائٹ www.shibliinternational.com پر دستیاب ہیں، ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اس سے استفادہ کریں گے۔

صدائے شبلی کے قارئین اور اہل وطن کو ادارہ کی طرف سے یوم جمہوریہ مبارک ہو۔

مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

عبادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

فرائض پنج گانہ کے علاوہ آپؐ کم از کم سنن ونوافل کی ۳۹ رکعتیں روزانہ معمولاً ادا کرتے تھے، دو صبح، چار چاشت، چھ ظہر، چھ عصر، چار پہلے اور دو بعد نماز (حسب روایت حضرت عائشہؓ) دو مغرب، چھ عشاء، تیرہ تہجد، وتر، ان کے علاوہ صلوٰۃ الاوابین، سنت تحیتِ مسجد وغیرہ الگ تھیں، تمام سنن میں سب سے زیادہ صبح کی دو رکعتوں کے آپ سختی سے پابند تھے۔ کسی وقت کی سنت خلافِ معمول اگر چھوٹ جاتی، تو اس کی قضا پڑھتے، حالانکہ اصل شریعت کی رو سے اس کی ضرورت عام امت کے لیے نہیں، ایسا واقعہ حضر میں صرف ایک ہی دفعہ پیش آیا ہے، ظہر وعصر کے درمیان ایک وفد خدمتِ اقدس میں بارياب ہوا، جس کی وجہ سے آپؐ ظہر کے بعد کی دو رکعت نہ پڑھ سکے، نماز عصر کے بعد آپؐ نے بعض ازواجِ مطہرات کے حجروں میں جاکر دو رکعت نماز ادا کی چونکہ یہ نماز بالکل خلافِ معمول تھی، اس لیے ازواجِ مطہرات نے استفسار کیا، آپؐ نے واقعہ بیان فرمایا، عام امت کے لیے ایک نماز کی قضا ایک دفعہ کافی ہے، لیکن چونکہ آپؐ جس چیز کو شروع کرتے تھے، پھر اس کو ترک کرنا پسند نہیں فرماتے تھے، اس لیے ام المومنین حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ آپؐ نے اس قضا کو تمام عمر ادا کیا۔

رمضان کا مہینہ آپؐ کی عبادتوں کے لیے سب سے زیادہ ذوق افزا تھا، حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ ''آپؐ فیاض تو تھے ہی لیکن جب رمضان کا مہینہ آتا اور جبرئیل قرآن سنانے آتے تو آپؐ کی فیاضی کی کوئی حد نہ رہتی''، آپ کی فیاضی ہوا سے بھی آگے نکل جاتی، رمضان کے آخری عشرے میں آپؐ اور زیادہ عبادت گزار ہوجاتے، حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو آپؐ رات رات بھر بیدار رہتے تھے، ازواج سے بے تعلق ہوجاتے تھے، اہل بیت کو نماز کے لیے جگاتے تھے، اس اخیر عشرہ میں آپ عموماً اعتکاف میں بیٹھا کرتے تھے، یعنی ہمہ وقت مسجد میں بیٹھ کر یادِ الٰہی اور عبادت گزاری میں مصروف رہتے تھے۔

قرآن مجید کی تلاوت روزانہ فرماتے تھے، ابوداؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت کا وقت نماز عشا کے بعد تھا، روزانہ سورتوں کی تعداد مقرر تھی، اسی تعداد کے موافق آپؐ تلاوت کیا کرتے تھے، رمضان میں پورے قرآن کا دورہ کرتے تھے، پچھلی رات کو اٹھ کر کوئی موثر سورہ یا چند آیات تلاوت کرتے تھے، حضرت ابن عباسؓ کہتے تھے کہ ایک دفعہ رات کو میں نے دیکھا کہ آپؐ پچھلے پہر بیدار ہوئے، آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے، رات کے سناٹے میں تارے جھلملا رہے تھے، آپؐ نے نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور یہ آتیں پڑھیں۔

ترجمہ: آسمان اور زمین کی پیدائش اور شب وروز کے انقلاب میں ان دانشمندوں کے لیے نشانیاں ہیں، جو اٹھتے بیٹھتے اور پہلو پر لیٹے ہوئے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان وزمین پر غور کرتے ہیں کہ خدایا تو نے یہ (نظام عالم) بے نتیجہ نہیں پیدا کیا، تو پاک ہے، پس ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، خدایا جس کو تو دوزخ میں داخل کرے اس کو تو نے رسوا کردیا، گنہگاروں کا کوئی مددگار نہیں، خداوندا ہم نے ایک پکارنے

والے کی آواز سنی جو پکار کر یہ کہہ رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لائے، خداوندا تو ہمارے گناہ بخش دے، ہماری برائیوں پر پردہ ڈال اور نیکیوں کے ساتھ ہم کو دنیا سے اٹھا، خداوندا تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ ہم سے جس چیز کا وعدہ کیا ہے وہ ہم کو عنایت کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا، پروردگار نے پکار سن لی اور دعا قبول کر لی کہ میں کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا، مرد ہو یا عورت، تم ایک دوسرے سے ہو، جنہوں نے ہجرت کی، یا اپنے گھروں سے نکالے اور میری راہ میں ستائے گئے ہیں اور وہ لڑے ہیں اور مارے گئے ہیں، ان سب کے گناہوں کو مٹا دوں گا اور ان کو جنت میں جگہ دوں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اللہ کی طرف سے ان کو یہ جزا ملے گی اور اللہ ہی کے پاس اچھی جزا ہے۔ (آل عمران ۳: ۱۹۰ تا ۱۹۵)

اسی موقع پر آپؐ یہ الفاظ بھی کہا کرتے تھے جو سر تا پا اثر اور روحانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں:

ترجمہ: خداوندا تیری حمد ہو، تو آسمان و زمین کا نور ہے، تیری حمد ہو، تو آسمان و زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب کا پروردگار ہے تو حق ہے، تیرا وعدہ حق ہے، تیری بات حق ہے، تجھ سے ملنا حق ہے، جنت حق ہے، دوزخ حق ہے، قیامت حق ہے، خداوندا میں نے تیرے ہی آستانہ پر سر جھکایا ہے، تجھی پر ایمان لایا ہوں، تجھی پر میں نے بھروسہ کیا ہے، تیرے ہی زور پر جھگڑتا ہوں، تجھی ہی سے فیصلہ چاہتا ہوں، تو میرا اگلا اور پچھلا، کھلا اور چھپا ہر ایک گناہ معاف کر، تو ہی میرا معبود ہے، تیرے سوا کوئی اور معبود نہیں۔

کبھی گھر کے لوگ جب سو جاتے، آپؐ چپ چاپ بستر سے اٹھتے اور دعا و مناجات الٰہی میں مصروف ہو جاتے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک رات میری آنکھ کھلی تو آپ کو بستر پر نہ پایا، سمجھی کہ آپؐ کسی اور بیوی کے حجرے میں تشریف لے گئے، اندھیرے میں ادھر ادھر ٹٹولا تو دیکھا کہ پیشانی مقدس خاک پر ہے اور آپؐ سر بہ سجود و دعا میں مصروف ہیں، یہ دیکھ کر حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ مجھ کو اپنے شبہ پر ندامت ہوئی اور دل میں کہا، سبحان اللہ! ہم کس خیال میں ہیں اور آپؐ کس عالم میں، کبھی کبھی راتوں کو اٹھ کر آپؐ تن تنہا قبرستان میں تشریف لے جاتے تھے اور دعا و زاری کرتے تھے، ایک دفعہ آپؐ کے پیچھے پیچھے حضرت عائشہؓ گئیں تو دیکھا کہ آپؐ جنت البقیع میں داخل ہوئے اور دعا مانگی۔

دعا اور نماز کے بعد آپ سو جاتے، یہاں تک کہ خراٹے کی آواز سنائی دیتی کہ دفعتاً سپیدۂ صبح نمودار ہوتا، آپؐ بیدار ہوتے، صبح کی سنت ادا کر کے مسجد کو تشریف لے جاتے اور اس وقت یہ الفاظ زبان مبارک پر ہوتے:

ترجمہ: خدایا میرے دل میں نور پیدا کر اور میری زبان میں اور میری قوت سامعہ میں نور پیدا کر آنکھوں میں نور پیدا کر اور میرے پیچھے اور میرے آگے نور پیدا کر، میرے اوپر اور میرے نیچے نور پیدا کر، خدایا مجھے نور عطا کر۔

ارکان نماز میں سب سے کم وقفہ رکوع کے بعد قیام میں ہوتا ہے، لیکن حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ رکوع کے بعد اتنی دیر کھڑے رہتے تھے کہ ہم لوگ سمجھتے تھے کہ آپ سجدہ میں جانا بھول گئے۔

جو چیز نماز کی حضوری میں خلل ڈالتی تھی، اس سے احتراز فرماتے تھے، ایک دفعہ چادر اوڑھ کر نماز ادا فرمائی، جس میں دونوں طرف حاشیے تھے، نماز میں اتفاق سے حاشیوں پر نظر پڑ گئی، نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ یہ لے جا کر فلاں شخص (ابوجہم) کو دے آؤ اور ان سے انبجانی مانگ لاؤ، حاشیوں نے نماز کی حضوری میں خلل ڈالا۔

ایک دروازے پر منقش پردہ پڑا ہوا تھا، نماز میں اس پر نگاہ پڑی تو حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اس کو ہٹا دو، اس کے نقش و نگار حضور قلب میں خلل انداز ہوئے۔

(سیرۃ النبی، ص: ۱۹۸ تا ۲۰۲)

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

علامہ اقبال

علامہ اقبال (۱۸۷۷۔۱۹۳۸ء) علامہ شبلی سے بیس سال چھوٹے یعنی ان کے بعد کی نسل سے تھے، ان کے افکار سے متاثر بھی تھے۔ مراسم اور خط وکتابت بھی رہی۔ علامہ اقبال نے اپنی کتاب علم الاقتصاد کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

> ''مخدوم ومکرم جناب قبلہ مولانا شبلی نعمانی مدظلہ بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح دی''۔ (ص ۶)

اب تک ماہرین اقبالیات یہ طے نہیں کر سکے کہ شبلی نے اقبال کی زبانی کی اصلاح کب کی تھی، اور آیا اصلاح کا یہ عمل خط وکتابت کے ذریعہ ہوا یا ملاقات کے۔ اس لئے کہ دونوں کی پہلی ملاقات کا سنہ اب تک ۱۹۱۱ء ہی ہے، جب دہلی میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں یکجا ہوئے تھے۔

مولوی سید احمد مرتضی نظر

مولوی سید احمد مرتضی نظر (۱۸۷۸۔۱۹۴۲ء) پختہ مشق اہل قلم، مورخ ومصنف اور قادر الکلام شاعر تھے۔ اصلاً نصیر آباد ضلع رائے بریلی یوپی کے باشندہ تھے مگر ان کے والد نے سیرونج میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ یہ بھی سیرونج ہی کی خاک کا پیوند ہوئے۔ انھوں نے دو بڑی اہم تاریخی کتابیں ''آثار مالوہ'' اور ''صولت شیر شاہی'' (مطبوعہ: ۱۹۳۴ء) سپرد قلم کیں۔ علامہ شبلی سے ان کے تعلقات اور خط وکتابت تھی، علامہ کی وفات پر انھوں نے جو قطعہ تاریخ کہا تھا وہ حیات شبلی میں شامل ہے۔ انھوں نے صولت شیر شاہی کے دیباچہ میں علامہ شبلی کا قول نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان کی عمر گو بہت کم ہے لیکن یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ اپنے عاشقوں اور قدردانوں کی خاص توجہ سے اس نے ترقی کے مدارج کو اس قدر جلد طے کرلیا کہ بقول علامہ شبلی مرحوم علمی زبان کی بلند کرسی پر پہونچنے کے قریب ہوگئی''۔
>
> (صولت شہر شاہی ص ۶)

خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی (۱۸۷۸۔۱۹۵۵ء) سے علامہ شبلی کے گہرے تعلقات تھے۔ متعدد ملاقاتوں کا ذکر ملتا ہے۔ عرصہ تک خط وکتابت رہی۔ ۱۹۲۹ء میں خواجہ صاحب نے اپنی کتاب ''اتالیق خطوط نویسی'' شائع کی جس میں انھوں نے اپنے خطوط کے ساتھ نامی مسلمانوں کے خطوط شامل کئے ہیں، اس میں علامہ شبلی کے بھی بیس خطوط ہیں۔ خواجہ صاحب کے ذخیرہ خطوط میں انگریزی، ہندی، گجراتی اور اردو کے ناموروں کے متعدد خطوط تھے، مکتوب نگاروں کا ذکر انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ سن کر اردو کے ایک لفافہ نے

اپنے ساتھیوں کو غور سے دیکھا کہ کون کون
موجود ہیں، تو معلوم ہوا کہ لسان العصر حضرت
اکبر الہ آبادی کا کارڈ ہے۔ مولانا شبلی کا لفافہ
ہے، مولانا ابو الکلام آزاد کا مکتوب ہے۔ ڈاکٹر
محمد اقبال کا لیٹر ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا
صحیفہ ہے۔ حکیم نور الدین خلیفہ مرزا صاحب کا
نامہ ہے۔ اور نواب محسن الملک اور مولانا حالی
کے خطوط ہیں"۔(اتالیق خطوط نویسی ص ۳۵)

خواجہ صاحب اپنے عہد کے ادیبوں کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"آج کل کے زمانہ میں مسٹر محمد علی،
مسٹر ظفر علی، ابو الکلام صاحب آزاد، ڈاکٹر شیخ
محمد اقبال صاحب اور مولانا سید اکبر حسین
صاحب الہ آبادی اردو کے بے مثل ادیب
ہیں، علامہ شبلی رحلت کر گئے وہ بھی اسی زمرہ
میں تھے"۔(اتالیق خطوط نویسی ص ۴۰۔۴۱)

بعد ازاں خواجہ صاحب نے مکتوب نگاروں کا ایک ایک دو دو جملوں میں تعارف کرایا ہے، علامہ شبلی کے تعارف میں لکھتے ہیں:

"علامہ شبلی مورخ تھے، مبالغہ کی نگینی
سے ان کا قلم محفوظ تھا، تاہم سادہ نگاری میں بھی
ایسی دبی ہوئی شوخیاں لکھ جاتے تھے کہ انسان
گھنٹوں مزے لیا کرے۔"(ایضاً ص ۴۱)

اتالیق خطوط نویسی میں علامہ شبلی کے محض بیس خطوط شامل ہیں، دراصل اس میں شامل خطوط ایک انتخاب ہیں، خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر اقبال، مولانا ابو الکلام،
علامہ شبلی کے خطوط زیادہ تھے۔ میں نے ان
میں سے نصف سے بھی کم لئے ہیں، کیوں کہ
بعض مکتوب بالکل پرائیویٹ تھے اور بعض میں
کوئی ایسی ادبی بات نہ تھی جس سے پبلک کا
تعلق ہوتا۔"(ایضاً ص ۴۳)

اتالیق خطوط نویسی میں متعدد ناموروں کے خطوط شامل ہیں، ان میں اکبر الہ آبادی مولانا ابو الکلام آزاد، علامہ شبلی، ڈاکٹر اقبال، نواب محسن الملک، مرزا غلام احمد قادیانی، حکیم نور الدین قادیانی، منشی ذکاء اللہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر چار ادیبوں اور شاعروں کے متعدد خطوط شامل ہیں جب کہ آخر الذکر کے محض ایک ایک خط بطور نمونہ دیئے گئے۔ چند خطوط نیاز فتح پوری کے نام کے بھی درج کئے گئے ہیں، اکبر الہ آبادی کے خواجہ صاحب کے نام ایک ہزار سے زائد خطوط تھے جنھیں خواجہ صاحب نے بعد میں علاحدہ شائع کیا، مگر افسوس شبلی و آزاد کے خطوط تلف ہو گئے۔

خطوط کی ترتیب کے بارے میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

"ان کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر ادب
کے لحاظ سے رکھی گئی ہے۔ میرے عقیدے میں
اول درجہ جناب اکبر کے خطوط کا ہے اس لئے وہ
سب سے اول ہیں، اس کے بعد ابو الکلام
صاحب، پھر علامہ شبلی اور اس کے بعد ڈاکٹر
اقبال"۔(ایضاً ص ۴۴)

خواجہ صاحب نے بعض مکتوب نگاروں کے خطوط کی شمولیت کے اسباب بھی لکھے ہیں، اس میں علامہ شبلی بھی شامل ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"مولانا ذکاء اللہ صاحب سے میں
نے دریافت کیا تھا کہ آپ نے حضرت محبوب
الٰہی کی کوئی کرامات دیکھی ہے یا نہیں۔ یہ خط
اس سوال کا جواب ہے۔ اسی طرح علامہ شبلی،
مرزا صاحب قادیانی، حکیم نور الدین اور ابو

الکلام صاحب کے خطوط کوتصور کرنا چاہئے کہ
میرے ایک مخصوص سوال کے جواب میں
ہیں۔ان کو درج کرنے کی دو وجہیں ہیں ایک تو
یہ کہ ناظرین ان مشہور ومعروف حضرات کا
نمونہ تحریر دیکھ سکیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے
خیالات صوفیائے کرام کے متعلق عیاں
ہوجائیں''۔(ایضاص۴۴)

حافظ محمود شیرانی

حافظ محمود شیرانی (۱۸۸۰۔۱۹۴۶ء) ایک بڑے محقق تسلیم کئے جاتے ہیں اور یہ مرتبہ انھیں تنقید شعرالعجم ہی کی بدولت حاصل ہوا۔ انھوں نے اکتوبر۱۹۲۲ء سے جنوری ۱۹۲۷ء تک شعرالعجم پر تنقید لکھی جو غیر مسلسل طریقے سے بابائے اردو کی ادارت میں نکلنے والے رسالہ اردو اورنگ آباد میں شائع ہوتی رہی،۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی اردو نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔اسے احباب کے تقاضے پر کتابی شکل دی گئی ہے۔دو صفحے کے پیش کلام میں اس کی توضیح ہے۔

تنقید شعرالعجم چار پانچ برس تک رسالہ اردو میں شائع ہوتی رہی اور اس میں جو طرز تحقیق اختیار کیا گیا ہے اس سے ادبی دنیا میں عام خیال پیدا ہوگیا تھا کہ یہ تحقیق نہیں شبلی کی تنقیص ہے۔لیکن فاضل محقق اس کی تردید کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نہایت وثوق سے عرض کرتا ہوں کہ تنقید ہذا مولانا شبلی مرحوم کی فضیلت علمی کی منقصت نہیں ہے بلکہ محض احتجاج ہے اس مروجہ روش کے خلاف، جس میں ہمارے مصنفین تحقیق کی جگہ تقلید سے اور عقل کی جگہ نقل سے کام لیتے ہیں۔ہم تاریخی واقعات اور سوانح وحالات کے لکھتے وقت اس قدر تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ ان کو نقد ونظر کی کسوٹی پر پرکھ لیں اور ان کی صحت ودرستی کے متعلق اپنا اطمینان کرلیں۔(تنقید شعرالعجم ص الف)

حافظ محمود شیرانی جس کو احتجاج بتارہے ہیں وہ دراصل خوردہ گیری کے ضمن میں آتا ہے۔کسی کے سنہ پیدائش میں یا کسی کتاب کے سنہ تصنیف میں دو قول ہوسکتے ہیں اور کسی ایک کو صحیح قرار دے کر اور اس کی رائے کو راجح قرار دینا اگر واقعی تحقیقی ہے تو بلاشبہ حافظ محمود شیرانی نے تنقید شعرالعجم لکھ کر بڑا کارنامہ انجام دیا ہے لیکن بہت سے اہل قلم نے ان سے اتفاق نہیں کیا ہے اور خود ان پر بھی یہی اعتراض کیا ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ راقم نے اپنی کتاب آثار شبلی میں اس کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے، بہرحال اس تنقید کا یہ نتیجہ ہوا کہ جس یونیورسٹی نے شعرالعجم پر ڈیڑھ ہزار انعام دیا تھا اور اسے اپنے نصاب میں شامل کیا تھا اسی نے اسے نصاب سے خارج کردیا۔شیرانی صاحب لکھتے ہیں:

> ''لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ پنجاب یونیورسٹی نے ایم اے کے نصاب سے خارج کردیا ہے تو مجھے بڑا رنج ہوا اور میں نے تنقید کا سلسلہ ختم کردیا''۔
>
> (ص ب)

اگر یہ تحقیق تھی تو شیرانی صاحب کو اس سلسلہ کو جاری رکھنا چاہئے تھا، جس کتاب میں اس قدر اغلاط ہوں کہ وہ نصاب سے خارج کردی جائے اس کی تحقیق ضروری امر تھا مگر دراصل یہ واقعہ نہیں جہاں تک انھیں جدید مطبوعات حاصل رہیں جو شبلی کے عہد میں نایاب مخطوطہ تھیں اور ان کی رسائی وہاں تک نہیں ہوسکی تھی تب تک یہ سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد وہ کیا کرتے اور دراصل بابائے اردو اور شیرانی صاحب کی خواہش کی تکمیل بھی ہوچکی تھی۔

مفتی امانت علی قاسمی۔ استاذ دارالعلوم حیدرآباد

مدارس کا تعلیمی منظر نامہ

ہندوستان میں دینی مدارس مسلمانوں کے مضبوط قلعے ہیں ،ان مدارس نے اسلامی تہذیب و تشخص ،روایات و اقدار، اسلامی تعلیمات وعقائد اور مسلمانوں کے ایمان و یقین کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا ہے، جب بھی ہندوستان کی تاریخ لکھی جائے گی ،انگریزوں کے ظلم و بربریت کی داستان خوں چکاں تحریر کی جائے گی ، غلام ہندوستان میں مسلمانوں سے ان کے سرمایہ افتخار کو سلب کرنے کی کوششوں کا تذکرہ کیا جائے گا تو دینی مدارس کے کردار پر ضرور بحث ہوگی ، یہ مدارس روشنی کے وہ بلند مینار ہیں جن کی ضیا بار کرنوں سے ہندوستانی مسلمان اپنے دل کی اندھیر وادیوں میں روشنی کا دیا جلاتے ہیں، اسی روشنی سے اپنا قبلہ درست کرتے ہیں اور اپنا مستقبل آراستہ کرتے ہیں اور یہ وہ حقیقت ہے جس سے نہ کسی مؤرخ کو انکار ہوگا اور نہ ہی کسی تبصرہ نگار کے لئے نقد و جرح کی گنجائش۔

اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مدارس کے کردار تعلیم ،نظام تعلیم ،اور نصاب تعلیم پر آئے دن گرما گرم بحث ہوتی رہتی ہے، مختلف حلقوں میں اس پر سیمینار کرائے جاتے ہیں ،بڑے بڑے پروگرام ہوتے ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ زیادہ تر پروگرام مدارس کی چہاردیواری سے باہر منعقد کئے جاتے ہیں، اور اس کار خیر کو انجام دینے والے زیادہ تر مدارس سے محبت کرنے والے مخلصین ہوتے ہیں جنہیں مدارس کے نظام کو زیادہ بہتر بنانے کی فکر ہوتی ہے، یہ غور و خوض اور بحث و تبصرہ کوئی غلط چیز نہیں ہے کہ جس پر کان دھرنے کی ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ ہر طرح کے سوال و مشورے کا کھلے دل سے استقبال ہونا چاہئے اور اگر اپنی کمزوری ہے تو اسے دور کرنے کی کوشش ہونی چاہئے۔

کسی بھی تعلیم کے بنیادی تین عناصر ہوتے ہیں ،نصاب ،اساتذہ اور طلبہ، مدارس کا نصاب جو درس نظامی کے نام سے مشہور ہے دینی اور اسلامی علوم پر مشتمل ہے، ان عناصر میں پہلا عنصر نصاب تعلیم ہے جس کے سلسلے میں مختلف حلقوں سے مطالبہ ہوتا رہتا ہے اور بہت زور شور سے یہ بات اٹھائی جاتی ہے کہ اس میں تبدیلی ہونی چاہئے یہ نصابِ تعلیم بہت قدیم ہے جس میں زمانے کے چیلنجوں کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے ،اس کا مطلب یہ ہے کہ مدارس سے جس معیار کے افراد تیار کرنے کی توقع ہے وہ توقع پوری نہیں ہو پا رہی ہے اور اس کی وجہ نصاب کی کمی اور ناقص ہونا ہے، اگر تبدیلیِ نصاب کی یہی وجہ ہے جو میں سمجھ پا رہا ہوں تو سوال یہ ہے کہ کس معیار کے افراد کی توقع کی جا رہی ہے ؟ کیا مدارس کے فضلاء کو عالم فاضل ہونے کے ساتھ ڈاکٹر انجینئر بھی ہونا چاہئے ،فقہ میں مہارت کے ساتھ سائنس اور ریاضی میں بھی دسترس حاصل کرنا چاہئے ،حدیث کے عالم ہونے کے ساتھ اقتصادیات اور معاشیات کا بھی امام ہونا چاہئے اگر یہ توقع ہے تو سوال کا دوسرا رخ بھی ہو سکتا ہے کہ عصری دانش گاہ جہاں قوم کے پچانوے فیصد بچے پڑھتے ہیں جو ذہن و دماغ کے اعتبار سے اعلی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں اور جہاں انجینئر ، ڈاکٹر اور سماج کی ضرورت کو سامنے رکھ کر ہر میدان کے افراد تیار کئے جاتے ہیں کیوں نہیں ان دانش گاہوں میں عصری کتابوں کے ساتھ ساتھ دینی علوم کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں تا کہ اقبال کے جس مردِ مومن کو مدارس میں تلاش کیا جا رہا ہے وہ ان دانش گاہوں سے حاصل ہو جائیں ۔اور اگر تبدیلی نصاب کا مطلب عصری مضامین شامل کرنا نہیں ہے ؛ بلکہ اسلامی علوم میں تنوع پیدا کرنا اور اسلامیات کی

موجودہ دور کی کتابوں کو شامل کر کے اسلامیات کے ماہر فضلاء تیار کرنا ہے تو یہ جذبہ قابل قدر ہے اسے قبول کرنا چاہئے۔

اس تمہید کے بعد میں اپنے قارئین کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جن مدارس میں تبدیلئ نصاب کی بات کی جارہی ہے ضروری ہے کہ پہلے ان اسباب اور مقاصد کو پیش نظر رکھا جائے جس پس منظر میں مدارس کا وجود عمل میں آیا، غلام ہندوستان میں انگریزوں نے مسلمانوں کے ایمان وعمل کو سلب کرنے کے لئے جو فارمولے تیار کئے اس میں تعلیمی فارمولہ بھی تھا جس کی ذمہ داری لارڈ میکالے کے سپرد تھی اس کا نظریہ اور مقصد مسلمانوں سے ایمان اور ان کی تہذیب وروایات کو ختم کرنا تھا اور ایک ایسی نسل تیار کرنی تھی جو اگرچہ عیسائی نہ ہوں؛ لیکن مسلمان بھی نہ ہوں، جو اپنے رنگ ونسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں، لیکن اپنی تہذیب وکلچر کے اعتبار سے انگریزی ہوں، مسلمان نہ صرف یہ کہ جسمانی اعتبار سے غلام ہوں؛ بلکہ فکری اعتبار سے بھی پابند سلاسل ہوں، وہ مغربی تہذیب سے نہ صرف مرعوب ہوں؛ بلکہ اس کے مکمل اسیر بھی ہوں، ان نظریات کے فروغ دینے اور انہیں عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد شروع ہو چکی تھی ایسے خطرناک حالات میں اسلامی تعلیمات ،اسلامی عقائد اور اسلامی تہذیب کی بقاوحفاظت بہت ضروری تھی ورنہ ہندوستان میں بھی اسپین کی تاریخ دوہرائی جاتی اور اسلام ہندوستان سے جلاوطن ہوجاتا یہی وہ اسباب وعوامل تھے جن میں دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا اور پھر چراغ سے چراغ جلتے گئے اور پورے ہندوستان میں مدارس کا جال بچھ گیا تاکہ اسلام اور مسلمانوں کا تحفظ کیا جاسکے اور اسلامی روایات واقدار کو بچایا جاسکے۔

دارالعلوم اور اس کے طرز پر قائم دینی مدارس کا مقصد اسلام کا محافظ دستہ تیار کرنا ہے جو اسلامی تعلیمات کی مکمل حفاظت کر سکے اس مقصد کے لئے صرف دینی علوم کی کتابیں رکھی گئیں تا کہ اسلام کے ماہرین تیار ہوں اور جدید چیلنجوں کو قبول کرنے والے اور اس کا جواب دینے والے علماء تیار ہوں، نئے مسائل کا قرآن وحدیث کی روشنی میں حل بتانے والے فقہاء اور ارباب افتاء تیار ہوں اب اگر عصری علوم کو شامل نصاب کیا گیا تو مدارس اپنا ہدف کھودیں گے، مدارس نے کبھی بھی عصری علوم کو حاصل کرنے سے منع نہیں کیا ہے بلکہ اس سلسلے میں حضرت نانوتوی کا ارشاد گرامی بہت مفید ثابت ہوگا، مدارس میں عصری علوم کی عدم شمولیت کی بابت انہوں نے تین باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ عصری تعلیم اور علوم جدیدہ کے لئے سرکاری مدارس پہلے سے موجود ہیں ضرورت دینی تعلیم کے اداروں کی تھی اس ضرورت کے پیش نظر دارالعلوم قائم کیا گیا، دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ عصری علوم کی آمیزش دونوں کے لئے یکساں طور پر نقصان دہ ہے نہ دینی علوم میں مہارت پیدا ہوگی نہ عصری علوم میں، کہ زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب کے حق میں باعث نقصان دہ ثابت ہوگی، تیسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ علوم نقلیہ میں پختہ استعداد پیدا کرنے کے بعد اگر طلبہ سرکاری مدارس میں جاکر علوم جدیدہ حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ موید ہوگی۔(دارالعلوم کا نصاب تعلیم اور نظام تعلیم وتربیت، مضمون مولانا شوکت بستوی، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند شمارہ ۷ جلد ۹۱ جولائی ۲۰۰۷)

حضرت نانوتوی کے ارشاد سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ مدارس نے عصری علوم حاصل کرنے سے منع نہیں کیا ہے ،جہاں تک سوال ہے کہ اسلامی علوم میں تنوع پیدا کیا جائے اور جو علوم اور کتابیں ناقابل فہم ہیں ان کی جگہ دوسری کتابیں شامل کی جائیں تو یہ مطالبہ بجا اور قابل قدر ہے؛ لیکن اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ ارباب مدارس اس پر غور کرتے ہیں اور جزوی تبدیلی مدارس کے نصاب میں ہوتی رہتی ہے چنانچہ رسالہ میر زاہد ، ملا جلال ، ایساغوجی ، شمس بازغہ ،صدرا ، قوشجہ ،شرح مواقف ، توضیح تلویح ، مسلم الثبوت ،ان جیسی پہلے بہت سی کتابیں داخل

درس تھیں اب اس کا نام بھی کسی کو نہیں معلوم ہے اس لئے تبدیلی نصاب کے علمبرداروں کی خدمت میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ کلی تبدیلی کہ فن بدل دیا جائے قرآن وحدیث وفقہ اور دوسرے علوم آلیہ کی جگہ کچھ اور پڑھایا جائے تو یہ مدارس کی روح اور اس کے مقاصد کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا، جو حضرات جوہری تبدیلی کی بات کرتے ہیں وہ یا تو مدارس کی حقیقت سے ناواقف ہیں یا نادان دوست ہیں اور جہاں تک جزوی تبدیلی کی بات ہے تو وہ قابل قبول ہے اور ارباب مدارس اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔

بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ نصابِ تعلیم پر بحث غیر ضروری ہے؛ لیکن اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ مدارس سے جس طرح کے فضلاء کی توقع کی جارہی ہے ایسے افراد تیار نہیں ہو پارہے ہیں اگرچہ کہ آج بھی مدارس کے فضلاء کی خدمات قابل ستائش ہیں لیکن تعلیمی معیار میں کمی ضرور آئی ہے جس کا اعتراف ارباب مدارس کو کرنا چاہئے اور اس کے اسباب کا پتہ لگا کر اس کا تدارک کرنا چاہئے اگر ہمارے گھر کی چھت کمزور ہوگئی ہے اور کوئی خیر خواہ ہمیں خبر دے کہ آپ کی چھت کمزور ہوگئی ہے اسے درست کر لیجئے تو ہمیں بخوشی ان کی بات مان لینی چاہئے لیکن اگر اس مخلص کی بات کو بے جا تنقید سمجھ کر انکار کر بیٹھے تو اس کا نقصان ہمیں ہی اٹھانا پڑے گا اسی طرح ہمارے تعلیمی نظام میں کمزوری آئی ہے اس بات کو قبول کر کے درستگی کی فکر کرنی چاہئے ورنہ بہت ممکن ہے یہ خیر خواہ ہمارے تعلیمی جنازے میں شریک ہو کر ماتم کرنے کے بجائے ہمارا مذاق اڑائیں، اس لئے اچھی رائے کہیں سے بھی آئے اسے محسن کے احسان کی طرح قبول کر لینا چاہئے۔

ہمارا خیال ہے کہ تعلیم کے دوسرے تیسرے عناصر میں بہتری پیدا کر کے معیار کو بہتر کیا جاسکتا ہے، تعلیم کا دوسرا عنصر اساتذہ ہیں، اساتذہ کی حیثیت تعلیم میں ریڑھ کی ہڈی کی ہے، کسی بھی تعلیم میں اساتذہ کا کردار بنیادی اور مرکزی ہوتا ہے مدارس میں تعلیم ہی نہیں دی جاتی ہے؛ بلکہ تربیت اور تزکیہ کا فرض بھی انجام دیا جاتا ہے ،اساتذہ کی تربیت اور ان کی زندگی کے اثرات بچوں پر پڑتے ہیں ،اس لئے اساتذہ کے اخلاق وکردار بہت بلند ہونے چاہیے، جس طرح گھر کی چہار دیواری میں بچے ماں باپ سے متاثر ہوتے ہیں اسی طرح مدرسے کے احاطے میں بچوں کی نگاہیں اساتذہ پر رہتی ہیں، اساتذہ کا بچوں کے ساتھ شفقت وپیار اور ان کی بہتری کی ادنی کوشش بچوں کی زندگی میں غیر معمولی تبدیلی پیدا کر سکتی ہے ۔

یہاں بنیادی توجہ طریقہ تعلیم پر دینے کی ہے، طریقہء تدریس کوئی جامد اور غیر متحرک شئی نہیں ہے اور نہ اس میں تقلید کی ضرورت ہے، ہر وہ عمل جس سے بچے نصابی کتاب کو ضبط کر سکتے ہوں، اپنے مافی الضمیر کو ادا کر سکتے ہوں، اور وہ انداز گفتگو جس میں بچے کی سطح پر آ کر بات کی جائے اور بچے استاذ کی بات کو مکمل طور پر سمجھ رہے ہوں وہ طریقہ تدریس کہلاتا ہے، طریقہ تدریس کو کس طرح موثر بنانا ہے یہ استاذ کا اپنا فرض ہے اس کے لئے نہ تو کسی فلسفے کی ضرورت ہے نہ ہی کسی تربیت کی، آج بہت سے ادارے اساتذہ کی تربیت کے لئے کورس کراتے ہیں اور اساتذہ کو ٹریننگ دیتے ہیں میرے نزدیک یہ بھی ایک فضول اور عبث کام ہے اگر وہ استاذ مطلوبہ جماعت کو پڑھانے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے تو کوئی تربیت اس کیلئے مفید نہیں ہوسکتی ہے اور اگر وہ اس جماعت کو پڑھانے کا اہل ہے تو اسے کسی تربیت کی ضرورت نہیں ہے، تاہم بہت سی کہی اور سنی ہوئی باتیں انسان کی زندگی میں تبدیلی پیدا کرتی ہیں اسی کے پیش نظر تعلیم وتعلم کی چند سفارشات وگزارشات ذکر کی جاتی ہیں شاید کہ تعلیمی نظام کو بہتر بنانے میں مفید ثابت ہوں۔

☆ عربی کے ابتدائی درجات میں طریقہء تدریس میں تبدیلی بہت ضروری ہے نحو پڑھاتے وقت نحو کے قواعد کو پختہ کرا کر قواعد کو مثالوں سے سمجھانے کے لئے بلیک بورڈ کا استعمال کیا جائے اور ہر طالب کو پہلے خوب قواعد مستحضر کرائے جائیں پھر مختلف طریقے سے ان کی تمرین کرائی جائے تا کہ نحو پر طلبہ کو عبور حاصل ہو جائے۔

☆ عربی ادب میں طلبہ کو لکھنے اور بولنے پر زور دیا جائے اور نصابی کتابوں کی لغات علیحدہ کاپی میں لکھا کر ان پر

جملے بنوائے جائیں اور بولنے کی خوب مشق کرائی جائے یہ عربی مدارس کے لئے کسی المیہ سے کم نہیں ہے کہ آٹھ سال پڑھ کر بھی طلبہ اگر چہ عربی سمجھنے اور پڑھنے پر قادر ہوتے ہیں اور ہمارے تعلیم کا بنیادی مقصد قرآن وحدیث کا فہم پیدا کرنا ہے؛ لیکن اس طویل عرصے میں عربی بولنے اور لکھنے پر قادر نہیں ہوتے کچھ مستثنیات ہوتے ان کا اعتبار نہیں ہے اس کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ اس جانب توجہ نہیں دی جاتی ہے ورنہ سوم کی جماعت تک طلبہ اچھی طرح لکھنے اور بولنے پر قادر ہوسکتے ہیں، انگلش میڈیم اسکول میں پڑھ کر بچے انگریزی سیکھ سکتے ہیں تو عربی میڈیم مدارس میں بچے عربی پر قدرت کیوں نہیں حاصل کر سکتے ہیں۔

☆ عربی کا مشہور مقولہ ہے من حفظ المتون نال الفنون جو شخص متن کو حفظ کرلے گا وہ فن پر قابو پالے گا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ استعداد سازی میں حفظ متون کی بڑی اہمیت ہے، ہمارے مدارس میں اس پر توجہ نہیں دی جاتی ہے حتی کہ کئی سال حدیث کی کتابوں کو پڑھنے کے باوجود طلبہ کو چالیس احادیث یاد نہیں ہوتی ہیں یہ ایک قابل توجہ امر ہے، عربی کے تمام درجات میں حفظ پر زور دینا چاہئے اور ہر فن میں جو متون کی کتابیں ہیں ان کو یاد کرانے کا اہتمام ہونا چاہئے، نحو وصرف کی عربی کتابوں میں جو قواعد ہیں ان کے حفظ کا اہتمام ہونا چاہئے، اسی طرح فقہ میں متون کو یاد کرانا چاہئے مثلا عربی سوم میں قدوری پڑھائی جاتی ہے، قدوری فقہ کے متون میں شامل ہے اس کا کچھ حصہ سوم میں باقی حصہ دوسری جماعتوں میں یاد کرایا جاسکتا ہے اور اس کے جو فائدے ہیں وہ تجربہ کر کے دیکھے جاسکتے ہیں اسی طرح احادیث ہر جماعت میں ایک خاص مقدار میں یاد کرانی چاہئے تاکہ طلبہ کے حفظ خانے میں احادیث کا ذخیرہ موجود رہے ، ہمارے یہاں تو عام طور پر طلبہ قرآن کے حافظ ہوتے ہیں یہ بہت اچھی چیز ہے، عربی کی تعلیم سے پہلے بچے کو حافظ قرآن بنانا چاہئے عرب یونیورسٹیز میں تمام علوم میں حفظ پر زور دیا جاتا ہے حتی کے جو طالب علم حافظ قرآن نہیں ہوتا ہے اس کو کم از کم دس پارے حفظ کرنا پڑتا ہے، احادیث سند کے ساتھ یاد کرائی جاتی ہے، حفظ پر زور دینا ناگزیر امر ہے ارباب مدارس کو اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

☆ اونچی جماعتوں میں کتاب کو حل کرانے کے ساتھ ساتھ فن پر عبور پیدا کرانے کی ضرورت ہے اس کے لئے فن کی دیگر کتابوں کا مطالعہ کرایا جائے اور اس کی تلخیص لکھنے کا پابند کیا جائے اور طلبہ میں فن سے دلچسپی پیدا کی جائے ، اسی طرح نصابی سرگرمیوں کے ساتھ غیر نصابی سرگرمیاں بھی تعلیم کا اٹوٹ حصہ ہے، خارجی مطالعہ پر زور دیا جائے اس سے طلبہ میں مطالعہ کتب کا ذوق ورجحان پیدا ہوتا ہے، معلومات میں اضافہ کے ساتھ فکر میں وسعت پیدا ہوتی ہے، سوانحی وتاریخی کتابوں کے مطالعہ سے خاص کر حوصلے بلند ہوتے ہیں اور عزائم میں پختگی پیدا ہوتی ہے ، موبائل بینی کے شوق نے مدارس میں کتب بینی سے طلبہ کو دور کردیا ہے، یہ ایسا سم قاتل ہے جس کا فوری تدارک نہ کیا گیا تو مستقبل میں اس کے بھیانک نتائج سامنے آئیں گے۔

☆ طلبہ مدارس میں تحریری صلاحیت کو پروان چڑھانا بھی بہت ضروری ہے اور اس کے لئے مدارس میں منصوبہ بندی ضروری ہے، طلبہ مدارس میں ذہن ودماغ اور فکری صلاحیت کی کمی نہیں ہے ؛ بلکہ ضرورت اس کو صحیح رخ دینے اور اس کی اہمیت سمجھ کر اس جانب طلبہ کی صلاحیت کو لگانے کی ہے ابتدائی جماعتوں میں چھوٹے چھوٹے موضوعات پر مختصر مضامین تحریر کرائے جائیں اور آخری جماعتوں میں مقالہ نویسی کی مشق کرائی جائے، تحقیق اور اصول تحقیق سے روشناس کرا کر طلبہ میں تحقیق کا ذوق پیدا کیا جائے، آج طلبہ مدارس سے لکھنے کا عمل اس وجہ رخصت ہو رہا ہے کہ فراغت کے بعد شعبہ افتاء میں فتاوی نویسی کی مشق کے دوران املاء کی فحش غلطیاں پائی جاتی ہیں یہ تنقید کے لئے نہیں بیان واقعہ کے طور پر لکھ رہا ہوں ارباب مدارس کو اس جانب بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

☆ اساتذہ کے تعلق سے یہ بات بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ ان کا تقرر اور ان کی صلاحیتوں کا صحیح استعمال بہت ضروری ہے اولا قابلیت کی بناء پر تقرر ہونا چاہئے اور اس کے لئے

تنخواہ کا معیار بھی بلند کرنا چاہئے، عام طور پر باصلاحیت افراد تنخواہ کی کمی کی وجہ سے دوسرا مشغلہ اختیار کر لیتے ہیں اور مدارس کو قابل اساتذہ دستیاب نہیں ہو پاتے ہیں، اساتذہ بلند معیارِ تعلیم کی پہلی سیڑھی ہیں اگر اسے بہتر نہیں کیا گیا تو تعلیمی معیار کبھی بھی درست نہیں ہو سکتا ہے اس لئے باصلاحیت افراد کا انتخاب تعلیمی ترقی کے لئے بہت ضروری ہے پھر اساتذہ کو ان کے ذوق اور فن کی کتابیں پڑھانے کے لئے دی جائیں بعض مرتبہ اساتذہ کے فن سے مانوس نہ ہونے یا اس فن سے دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے طلبہ کو اس درجہ فائدہ نہیں ہو پاتا ہے جس درجہ طلبہ یا انتظامیہ کو امید رہتی ہے۔

☆ تعلیم کا تیسرا عنصر طلبہ ہیں، تعلیم کے گرتے معیار کے یہ طلبہ بھی ذمہ دار ہیں، بہت کم طلبہ اپنے ذوق وشوق اور اپنے طبعی رجحان سے مدارس میں داخل ہوتے ہیں زیادہ تر طلبہ اپنے والدین کی وجہ سے مدارس کا رخ کرتے ہیں اس لئے طلبہ میں علم دین حاصل کرنے کا وہ جذبہ نہیں پایا جاتا ہے جس کی ضرورت ہے اسی لئے مدارس میں طلبہ کی غیر حاضری، قانون شکنی، اسباق سے بے توجہی عام ہوتی جارہی ہے؛ بلکہ بعض طلبہ میں جلدی سندِ فضیلت حاصل کرنے کا رجحان پایا جارہا ہے اس لئے درمیان کے کئی سالوں کو حذف کر کے اوپر جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں، مدارس میں طلبہ کا رجوع پہلے کے مقابلے میں کم ہو گیا ہے اس لئے مدارس کو طلبہ کی ضرورت ہوتی ہے ایسے میں بہت سے مدارس میں بغیر تعلیمی صداقت نامہ دیکھے اوپر کی جماعتوں میں داخلہ دے دیا جاتا ہے اس اعتبار سے یہ مدارس بھی ذمہ دار ہیں اور جب طلبہ کا مقصد ہی صرف سندِ فضیلت حاصل کرنا ہے تو پڑھنے کا شوق کہاں سے پیدا ہوگا ایسے طلبہ غیر ضروری مصروفیتوں میں مشغول ہو کر اصل مقصد کو بھول جاتے ہیں جس کی وجہ سے مدارس کا دینی اور روحانی عنصر بھی کمزور پڑتا جارہا ہے۔

بہر حال مدارس کا ایک شاندار ماضی ہے جس نے ہر دور میں ملت کی رہنمائی اور قیادت کا فرض انجام دیا ہے اور آج بھی مدارس اپنے نصب العین کی طرف گامزن ہیں اور ہندوستانی مسلمان کے ایمان وعقائد، تہذیب وروایات کی حفاظت کر رہے ہیں، لیکن ضرورت ہے اس جانب ہونے والی بعض کوتاہیوں کا تدارک کیا جائے تاکہ مدارس کی روح اور ان کے مقاصد کا صحیح طور پر تحفظ کیا جاسکے اس کے لئے انتظامیہ، اساتذہ اور طلبہ ہر ایک کو اپنا فرض پورا کرنا چاہئے تو ان شاء اللہ پھر اسی خاکس کے پردے سے جنید وشبلی اور رومی وغزالی پیدا ہوں گے۔

ڈاکٹر رحیم رامشؔ ۔ تلنگانہ

غــزل

جن کی سانسوں میں محبت کا جوالا دیکھا
حوصلہ پیار کا مانندِ ہمالہ دیکھا

خود ہی واپس ہوئے دشمن بھی پریشاں ہو کر
ثور کے غار پہ جب مکڑی کا جالا دیکھا

دور یہ کیسا چلا آیا ہے خود غرضی کا
چھینتے بھائی کا بھائی سے نوالہ دیکھا

اب میسّر نہیں دو وقت کی روٹی بھی جنہیں
ایسے لوگوں کا یہاں شوق بھی اعلیٰ دیکھا

عدل و انصاف کی باتیں جو کیا کرتے تھے
اب زبانوں پہ پڑا اُن کے ہی تالا دیکھا

خود عمل کرنے کی کوشش بھی کیا کرتا ہوں
جب بھی قرآں کا حدیثوں کا حوالہ دیکھا

سرخرو ہوتے گئے جو بھی یہاں دنیا میں
اُن کا کردار بہت ارفع و اعلیٰ دیکھا

وہ بھی گھپلوں میں گھٹالوں میں تھے شامل رامشؔ
جس کسی کو یہاں جیتے ہوئے مالا دیکھا

مولانا افتخار رحمانی۔نئی دہلی

منصورِ ہند صوفی سرمد شہیدؒ: کتابِ زیست کے چند گم شدہ اوراق

سرمدؔ غمِ عشق بوالہوس را نہ دہند
سوزِ غمِ پروانہ مگس را نہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار
ایں دولتِ 'سرمدؔ' ہمہ کس را نہ دہند

دلی کے بائیس خواجہ نامی ایک کتاب نظر سے گزری یا قدرتاً نظرسی گزاری گئی۔اس میں پڑھا تھا کہ جامع مسجد سے متصل منصور ہند صوفی سرمد کی قبر ہے جن کا سر حضرت اورنگ زیبؒ نے ''اناالحق'' کی صدا کے جرم میں قلم کروایا تھا۔تاریخی حوالہ جات میں جس طرح سرمدؔ کا ذکر ملتا ہے وہ حقیقت کم افسانوی صورت کچھ زیادہ ہی اختیار کر گیا ہے، اس پر مستزاد یہ کہ واقعہ نگاروں نے اپنی طرف سے اس میں کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے، جس کے باعث اصل حقائق گم ہوکر افسانہ بن گئے۔جب دہلی کی جامع مسجد گیا تو ازراہ محبت 'عشق' کی اس لامثال نشانی کو دور سے ہی دیکھتا رہا؛ کیوں کہ اپنی تعلیم و پرورش کی وجہ سے چاہ کر بھی قریب نہ جاسکا (ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ ان جیسے صوفیا کہ جن کی قبروں پر نام نہاد مکار مولوی نما لوگوں نے قبضہ جما کر ہندوں اور مشرکوں کی طرح، ان کی قبر کو سجدہ گاہ بنالیا ہے، ان کی سوانح حیات، ملفوظات میرے مطالعہ میں رہا کرتے ہیں۔میں خود حضرت نظام الدین اولیاء کا دل سے قدرداں اور ان کی عظمت کا قائل ہوں؛ لیکن ان کے مزار پر ہونے والی خرافات کا سخت مخالف بھی ہوں) یوں بھی سرمدؔ کو سرمدی زندگی ملی تھی، وہ جو بھی ہو؛ لیکن اس کے پس پردہ 'عشق' کی شورش اور افتاد کی گرانی کارفرما تھی، جس کی وجہ سے وہ مر کے بھی جاوداں ہوگیا اور گیتی 'عشق میں اس کی قلمرو اب بھی قائم ہے۔اس کے تذکرے میں عشق مجازی، ابھے چند (محبوب)، برہنگی، کلمۂ طیبہ کے اثبات و نفی میں اثبات (الا اللہ) کے بجائے صرف نفی (لا الٰہ) کا ذکر ملتا ہے، جس کے باعث طبیعت میں تکدر پیدا ہوا؛ لیکن یہ تکدر وقتی چیز تھا۔یہ سچ ہے کہ اس کے محبوب کا نام ابھے چند تھا، وہ ایرانی النسل تھا، غیر مسلم بھی تھا، غالباً وہ آرمینائی نسل سے تعلق رکھتا تھا، یعنی ایرانی یہودی تھا۔اسلام کی دولت اِس کو اُس وقت نصیب ہوئی جب ابھے چند نے نگاہِ کشتہ نے جگر کو خوں فشاں بنادیا تھا ،(ابھے چند کا ذکر میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا، کیوں کہ میرا وہ مقصود بالذکر بھی نہیں ہے) تذکرہ کے مطابق ابھے چند سے نظریں اس وقت چار ہوئی تھیں جب وہ اسلام کی دولت سے بہرہ ور نہیں ہوا تھا، یعنی وہ غیر مسلم ہی تھا۔الغرض سرمدؔ کی قبر خونیں نما مکان پر نظر پڑی، جس پر جلی حرفوں میں 'صوفی سرمد شہید' لکھا ہوا تھا۔صوفی سرمد شہید کا مزار عین جامع مسجد کے جنوب میں ہے۔مولانا آزاد نے بھی اسی کا ذکر کیا ہے۔آج ٹھیک امام الہند مولانا آزادؒ سرمد شہید کی قبر سے بمشکل دس قدم کی دوری پر شمال میں دائیں جانب واقع باغ میں محوخواب ہیں (اللہ تعالی ان کی قبر پر کروڑوں رحمت نازل فرمائے، آمین)۔یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ سرمدؔ ایران سے تجارت کے لیے چلا تھا، مگر یہاں ابھے چند (برہمن) کی نگاہ کشتہ نے سرمد کو حیات سرمدی کی راہ کا رہرو بنادیا، یہ بھی سچ ہے کہ عجمی صوفیاء جن میں حافظ شیرازی، مولانا رومی، شیخ سعدی جیسے صوفیاء ہیں، نے عشق مجازی کو عشق حقیقی کے

لیے زینہ تصور کیا ہے، جس پر علماء عرب نے سخت نکیر کی ہے، حتیٰ کہ علامہ ابن الجوزی نے اپنی کتاب ''تلبیس ابلیس'' میں اس کو بیان کرتے ہوئے شیطانی امور میں شمار کرتے ہیں، اسلام سے 'سوا' قرار دیا ہے۔ خیر! سرمدؔ تجارت کی غرض سے ہندوستان آیا تھا؛ لیکن اس کو دل کے سودے کرنے پڑ گئے۔ یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ کسی مقتل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جہاں پہلے ان کا دل کسی اور کا ہوگا، پھر وہ خود اس کا ہو کر رہ جائے گا۔ اس کے عشق پر دنیا ہنسے گی، طعنہ دے گی، اس پر کوڑے برسائے جائیں گے، علماء ظاہر؛ بلکہ درباری ملا جن میں 'ملا قوی' سرفہرست ہیں، ان پر فتاویٰ لگائیں گے، صاحب اقتدار کے سامنے ان کی پرسش ہوگی اور پھر یہ بھی ہوگا کہ اسے عین دہلی کی جامع مسجد سے متصل تختہ دار پر لٹکا دیا جائے گا کہ اس کی لاش پر کوئی اشک فشانی کرنے والا بھی نہ ہوگا۔ اگر اسے یہ علم ہوتا تو شاید کبھی بھی بغرضِ تجارت ہندوستان کا رخت سفر نہ باندھتا؛ لیکن سرمدؔ کی قسمت میں آبلہ پائی، ریگستاں نوردی، ٹھٹھہ کی ریت میں جلنا بھننا، گولکنڈہ کی خاک چھاننا اور پھر مقتل (دہلی) میں قیام پذیر ہوکر دہلی گیٹ کے قریب میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر نیم برہنہ یا برہنگی کے عالم میں جذب وکیف کی مستی میں 'استغراق' لکھا ہوا تھا؛ اس لیے کشاں کشاں ایران سے ٹھٹھہ آیا، پہلے تو اس کا دل اپنے قبضہ سے گیا، ٹھٹھہ میں قیام پذیر ہوا، مال واسباب دوسرے لوگوں نے مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹ لے گئے۔ کوئی عجیب نہیں کہ وہ اس صحرا نوردی میں حافظ کی غزل کا یہ مطلع گنگنا رہا ہو ؎

اگر آن ترک شیرازی بہ دست آرد دل ما را
بہ خال ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را

بنظر انصاف دیکھیں تو حافظ سرمد کی ترجمانی کر رہے ہیں اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ سرمدؔ ٹھٹھہ کی گرم ریتیلی سرزمین میں ننگے پاؤں معشوق کی یاد اور جستجو میں وصال کی آرزو پر سمرقند و بخارا نثار کر بیٹھتے، تاہم حافظ کے بیان سے بھی سرمد کا یہ جنون اور سرمستی بلند اور برتر تھی کہ سرمدؔ نے اپنا وجود اور اپنا مذہب اس کشتۂ جاں کی نذر کر دیا تھا۔ حافظ کا یہ شعر مبنی بر تعلّی ہے۔ واضح ہو کہ ٹھٹھہ سندھ میں واقع ہے اور سندھ میں ریگستان بھی ہے! کوئی بعید نہیں کہ ٹھٹھہ سے نکالے جانے کے بعد سرمدؔ نے تھر میں صحرا نوردی بھی کی ہو۔ مولانا آزاد نے اس تعلق سے لکھا ہے کہ:

''اس زمانے میں ایرانی سیاح عموماً سندھ ہو کر ہندوستان آتے تھے، سندھ کے شہروں میں ٹھٹھہ ایک مشہور شہر تھا جس کو اب نئے جغرافیہ میں گمنامی کا خانہ نصیب ہوا ہے۔ یہی ٹھٹھہ وہ سینائے مقدس تھا جو سرمدؔ کے لیے تجلی گاہ ایمن بنا اور لیلائے حسن نے اول اپنے چہرے سے نقاب الٹی۔ کہتے ہیں کہ ایک ہندو لڑکا تھا۔ جس کی چشم کافر نے یہ افسوں طرازی کی اور ایسا ہونا کچھ مستبعد نہیں؛ کیوں کہ عشق خیز دلوں کو 'وانیم' کرنے میں بخیہ گر کی سوئی اور جلاد کی تیغ دونوں برابر ہیں۔ یہاں تجارت میں خریدار عموماً بے پرواہ و بے نیاز۔ پھر جو لوگ اپنے دلوں کو ہاتھوں پر بطرز نذر رکھے ہوئے خریدار ڈھونڈتے ہوں انہیں تو حق ہی نہیں کہ خریدار میں خاص اوصاف کے طالب ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سادہ لوح ایرانی تاجر بھی متاع دل کی کسمپرسی سے تنگ آگیا تھا اور خود خریدار کو بے تابانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ جب خریدار مل گیا تو نظر اٹھا کے دیکھا تک نہیں کہ کون ہے اور کیا لے کے آیا ہے۔ اسی کو غنیمت سمجھا کہ دل جیسی متاع ارزاں کی ایک چشم سحر کار طالب ہے اور بلا تامل یہ سودا منظور کر لیا۔''

ایک دوسری جگہ مولانا آزادؔ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

''سرمدؔ کے لیلیٰ کا زیادہ سے زیادہ حال جو معلوم ہوتا ہے یہی کہ ایک ہندو لڑکا تھا اور غور کیجیے تو یہ بھی بہت ہے؛ کیوں کہ بازار عشق میں جب سودا چکایا جاتا ہے تو یہ کب دیکھا جاتا ہے کہ خریدار کون ہے۔ اور کیا قیمت مل رہی ہے ؎

مرا فروخت محبت ولے نمی دانم
کہ مشتری چہ کس ست و بہائے ما چند ست"

چند تذکرہ نگاروں نے اس درمیان یہ بھی نقل کیا ہے کہ سرمد ان ہی دنوں مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا؛ لیکن دل میں عشق کی جو چنگاری ابھے چند برہمن نے لگائی تھی، وہ چنگاری بجھنا تو کجا، مزید شعلہ نوا ہو چکی تھی۔ کچھ تذکرہ نگاروں نے یہ بھی کہا کہ جو کہ محض مبالغہ آرائی پر ہی محمول ہے، یہ کہ ابھے چند کو ایک ہی شب میں قرآن کی تعلیم بھی دی، دوسری شب میں حدیث کی، تیسری شب میں انجیل کی، چوتھی شب میں زبور کی۔ خدا بہتر جانے سرمد نے اپنے معشوق (ابھے چند) کو کس کس فن کی تعلیم دی، البتہ یہ ضرور تھا کہ ٹھٹھہ میں سرمد کا وصال ابھے چند سے ہوا تھا۔ خلوت میں بھی اور جلوت میں بھی، دونوں ساتھ رہتے۔ ابھے چند نے جب یہ دیکھا کہ سرمد میرے لیے اپنا مذہب، وطن، سب کچھ ترک کر چکا ہے تو پھر ابھے چند کا دل بھی پگھل گیا اور وہ بھی سرمد کے رنگ میں رنگ گیا۔ جس سے اہل محلّہ بھی نالاں ہوئے، حتیٰ کہ سرمد کو اس عشق کی وجہ سے شہر بدر بھی کر دیا گیا اور ابھے چند جو کہ کسی امیر برہمن زادہ تھا، اس پر بھی پہرے بٹھا دیئے گئے۔ مولانا آزادؒ نے سرمد کی صحرانوردی کا یوں ذکر کیا ہے:

"سرمد کو آئندہ جس صحرا میں بادیہ پیمائی کرنی تھی، یہ اس کی طرف پہلا قدم تھا۔ اور کچھ سرمد ہی کی خصوصیت نہیں، عشق خواہ کسی (کوئی) عنوان ہو منزل حقیقت کا ہمیشہ سے پہلا قدم ہے؛ بلکہ یہ کہنا بھی مشکل ہے۔ منزل حقیقت کا کیا ذکر، عشق تو وہ دروازہ ہے جس سے گزرے بغیر انسان انسان نہیں ہو سکتا، جس کے دل و جگر میں ٹیس اور آنکھوں میں تری نہیں، اس کو معنیٔ انسانیت سے کیا واسطہ؟ تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ زاہد معتکف بھی بایں ہمہ تقشف، جب اپنے زاویہ عبادت میں سر بہ زانو ہوتا ہے تو حور و غلماں کی مسکراہٹ سے لطف لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یعنی جو خشک دماغ مسجد کے گوشوں اور حجروں میں دوست کو ڈھونڈتے ہیں انہیں بھی اس تصور کے بغیر چارہ نہیں۔

حور و جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہ دوست
اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را"

یہی وجہ ہے کہ جو سوداز دگان حقیقت شاہد ازلی کے جاں دادہ ہیں، انہیں بھی مجازی کوچوں میں در و دیوار سے سر ٹکراتے دیکھا گیا ہے؛ کیوں کہ دل جب تک لذت آشنائے درد نہ ہو برف کا ایک ٹکڑا ہے جس کو پانی بنتے دیکھا ہے، مگر برف آگ میں جلتے ہوئے کبھی نظر نہ آئی۔ حالانکہ انسانیت کا مفہوم یکسر سوز و گداز ہے۔ اور عشق کا کلیسا آتش کدہ ہے، یہاں وہی آتش طلب قدم رکھ سکتے ہیں جو اپنے دلوں کو اس آتش کدہ پر نذر چڑھا دیں اور پھر دامن سے ہوا دیتے جائیں کہ کہیں شعلوں کی بھڑک کم نہ ہو جائے"

سرمد نے راہ عشق کے ان تمام سلوک کو اپنایا تھا، اُس ماہ رو کی تلاش میں مجازی کوچوں سے سر دیواروں سے ٹکرایا ہی نہیں تھا؛ بلکہ آبلہ پائی بھی کی، بلکہ اس آبلہ پائی کو متاع زیست بھی تصور کیا۔ دل کو عشق کے آتش کدہ میں نذر کر کے دامن سے جلتے ہوئے شعلوں کو ہوا بھی دیا تھا کہ کہیں مبادا اس کی آگ سرد نہ ہو جائے۔ سرمد نے ان کلیوں کو بحسن خوبی اپنایا، اسے نبھایا اور پھر محبوب کا وصال نصیب نہ ہو سکا تو خود کو کنج تنہائی میں خود کو ڈال دیا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر، ہجر و فراق کی اصلی تصویر بنے، سر پر تھر کی خاک ڈال کر خلق سے بیگانہ ہو گیا، اس کی ایک ہی دھن تھی اور وہ دھن محبوب کی یاد تھی، محبوب کے روئے تاباں کا دیدار تھی۔ ضعیف قول کے مطابق تقریباً آٹھ سے دس سال تک ٹھٹھہ اور لاہور میں گزار دیئے، اسی عالم ہجر میں سرمد نے اپنی رباعیات بھی مرتب کی۔ کاتب تقدیر نے نگاہ کشتہ کا شہید ہو کر حقیقی معنوں میں بھی شہید ہونا لکھا تھا اور پھر یہ بھی طے ہے کہ خود سرمد کو بھی اس کا یقین

تھا کہ چشم کافر نے جو آگ لگائی ہے اس کا انجام تختہ دار ہی ہے۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ آخر تختۂ دار ہی سرمد کا مقدر تھا یا پھر سیاست کی بے رخی، عناد اور حسد بھی اس کے قتل کی وجہوں میں شامل تھا، یا مخالف کو خاموش کرنے کے لیے شریعت کا سہارا لیا گیا تا کہ مخالفین یک زبان ہو کر صدائے احتجاج بلند نہ کر سکیں۔ کئی امور اس کے تحت تشنہ طلب ہیں جس کا تشفی بخش جواب نہیں دیا جاسکا ہے۔ البتہ اس تعلق سے من گھڑت باتیں اور بیہودہ عقیدے ضرور شامل کئے گئے ہیں، سینہ بہ سینہ حکایات خوب بڑھ چڑھ کر شائع کی گئیں، جس سے سرمد کا اصلی منظر نامہ چھپ کر رہ گیا، اور جس کے لیے وہ اس دنیا سے 'لاتعلق' ہوا تھا وہ مقصد ہی فوت ہو کر رہ گیا اور اس سے سرمد کا اصلی روپ اس مفروضات میں گم ہو کر رہ گیا۔ جب کہ لازم تو یہ تھا کہ سرمد کے متعلق تحقیق و مباحثہ کئے جاتے، اس کی زندگی کے پہلوؤں کو انصاف پسندانہ نظر سے عوام کے سامنے لائے جاتے، اس کو تاریخی حیثیت و رتبہ فراہم کیا جاتا ہے، مگر ستم ظریفی یہ کہہ لیں کہ تاریخ میں اس کا کہیں ذکرِ خیر تو کجا 'ذکر شر' بھی نہیں ہے؛ بلکہ مکمل طور پر پراسرار خاموشی ہے۔ مولانا آزاد نے بھی اس تعلق سے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے جز بز ہو کر لکھا کہ:

''عہد عالمگیری میں اور اس کے بعد جس قدر فارسی تذکرے لکھے گئے ہیں، ان میں بالعموم سرمد کے عنوان سے چند سطریں ملتی ہیں؛ لیکن اول تو قدیم تذکروں کے حالات اس قدر مختصر اور ناکافی ہوتے ہیں کہ اگر زندگی میں ان کے نام خطوط لکھے جاتے تو لفافہ کے لیے پورا پتہ بھی نہ میسر آتا اور پھر جو کچھ ہوں، وقت یہ ہے کہ اس وقت سامنے نہیں۔ میں نے عہدِ عالمگیری کی تاریخوں کو دیکھا کہ شاید حوادث و واقعات کے ضمن مین کچھ حالات مل جائیں؛ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پولیٹکل عاقبت اندیشوں نے قلم کو روک لیا تھا۔ مرزا محمد کاظم نے عالمگیر کے حکم سے تمام سوانح وحالات بقیدِ سنین قلم بند کرنے شروع کئے؛ لیکن صرف دس سال ہی کے حالات لکھے کہ حکماً یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد شاہ عالم کے عہد میں نواب عنایت اللہ کو خیال تکمیل ہوا، اس کے اشارے سے مستعد خان نے بقیہ چالیس سال کے سوانح قلم بند کئے اور ابتدائی دہ مجموعہ کا انتخاب شامل کر کے ''مآثر عالمگیری'' نام رکھا۔ میں نے ۱۰۷۰ھ کے حالات کی ورق گردانی کی کہ یہی سرمد کی شہادت کا سن ہے، مگر حالات کا ملنا تو ایک طرف، معلوم ہوتا ہے کہ پوری مستعدی کے ساتھ تاریخ کے صفحوں کو بچایا گیا کہ اس شہید عشق کے جامہ خونچکاں کے قطرہ افشانی سے حاشیہ پر کہیں دھبہ نہ پڑ جائیں۔ لطف یہ کہ اسی سال شاہ عباس ثانی اور حسین پاشا رومی (غالباً والی حجاز) کے سفراء آئے تھے، ان کے حالات کی سطریں صفحے کی انتہا تک پہنچ کر بھی آگے بڑھنے سے نہیں رکتیں۔''

کوئی عجب نہیں کہ عالم بالا میں دنیا کی ناانصافی پر سرمد سر پیٹتے ہوں اور حافظ کی زبان میں کہتے ہوں ؎

''ز رقیب دیو سیرت بہ خدائے خود پناہم
مگر آن شہاب ثاقب مددے دہد خدا را''

الغرض! جب ٹھٹھہ کی سرزمین سرمد کے لیے تنگ کر دی گئی اور یا بلفظ دیگر یوں کہہ لیں کہ عشق کی طرب انگیز نواؤں نے اپنے انجام کے لیے دعوت دی تو ٹھٹھہ چھوڑ کر وہ گولکنڈہ پہنچا، کاتب تقدیر نے سرمد کو دہلی کے لیے منتخب کیا تھا، سرمد دیوانہ وار گولکنڈہ چھوڑ کر دہلی آیا اور یہیں گلی کوچوں میں 'فنا گشتم من فنا گشتم' کا نعرۂ عشق بلند کرنے لگ گیا۔ خود سرمد نے بھی بڑی دیدہ دلیری، جوان مردی کے ساتھ دیوانہ وار کہا ہے ؎

''بیہودہ چرا در طلبش می گردی؟
بنشیں! اگر او خدا ست خود می آید''

ڈاکٹر سراج احمد انصاری۔ غازی پور (یوپی)

رُخ 2Rukh

مضمون کے عنوان میں مشمولہ دو الفاظ ہیں، جس میں اول اعداد وشمار کا دوسرا نمبر ’دوٗ‘ ہے اور دوسرا لفظ فارسی کا ’رُخ‘ ہے، جس کے معنیٰ رخسار، گال، طرف اور سمت وغیرہ کے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو عنوان کا لغوی معنیٰ، دو چہرہ، دو طرف یا دو سمت کے ہیں۔ زبان کی قواعد کے مطابق الفاظ و معنی کا رشتہ اس قدر گہرہ ہوتا ہے کہ کسی لفظ کا کوئی بھی مجازی معنی اخذ کیا جائے وہ اپنے حقیقی معنیٰ سے یکسر منسلک رہتا ہے۔ یہاں ’’دو رُخ‘‘ سے مراد، نیوز ۱۸ اردو، کے ذریعہ شروع کیا گیا وہ مباحثی پروگرام ہے، جس میں دو ایسے حضرات کو مدعو کیا جاتا ہے جو دو مختلف مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں حضرات کو ایک ہی مدعے پر گفتگو کرنی ہوتی ہے جس سے عوام کو ان کے افکار سے باخبر ہونے کے ساتھ زیر نظر مسئلے کی باریکیوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

موجودہ وقت کو عہدِ اطلاعات یعنی Age of information سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ۲۱ویں صدی کا یہ وہ زمانہ ہے جب ملک اور بیرون ملک کی ہر خبر کی اطلاع کے لیے ذرائع موجود ہیں۔ دلچسپی کی بنیاد پر زندگی کے ہر شعبہ جات کا علم بہت آسانی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ صرف کہنے کی بات نہیں ہے بلکہ کمپیوٹر اور ذرائع ابلاغ کی ترقی اس بات کی دلالت کرتی ہے۔ ایک بڑی تعداد میں News Channels، Portals اور Anchors ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ پانچ سے دس سال پہلے تک ہم صرف انہیں چینلس اور ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کو جانتے تھے جو نیشنل ہوتے تھے، اور شرط یہ تھی کہ وہ ہماری ٹی وی پر آتے ہوں۔ لیکن آج اتنے چینلس، انکرس اور پورٹلس ہیں کہ شمار کرنا مشکل ہے۔

ٹی وی پر جاری ہونے والے چینلس کے علاوہ بہت سے ایسے چینلس ہیں جو خبروں کو رکارڈ کرتے ہیں اور بعد میں یوٹیوب کے ذریعہ اسے نشر کرتے ہیں۔ گزشتہ چند برسوں میں بہت سے ذاتی چینلس شروع کیے گئے ہیں جہاں وڈیو تیار کرنے کے بعد یوٹیوب پر اپلوڈ کر دیا جاتا ہے اور انٹرنیٹ کے سہارے دنیا کے کونے کونے تک پہنچ جاتا ہے۔

آج دنیا بہت تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔ آج کسی بھی خبر کو تیار کرنے کے لیے کیمرہ اور نمائندے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ ہر کسی کے ہاتھ میں کیمرہ ہے اور وہ ذرائع ابلاغ کا نمائندہ۔ کچھ بھی ریکارڈ کر کے فیس بوک، یوٹیوب یا دیگر سوشل سائٹس پر اپلوڈ کر دو، وہ خود بخود لوگوں تک پہنچ جائے گا۔

نیشنل یا مین اسٹریم میڈیا کی بات کریں تو شام چار بجے سے آٹھ بجے تک آج تک، اے، بی، پی، زی نیوز وغیرہ پر مسلسل ڈبیٹ جاری رہتا ہے۔ جس میں ملک کی سیاسی تنظیموں کے سینیر ترجمان موجود ہوتے ہیں۔ ہر شو کا کچھ نہ کچھ نام ہوتا ہے مثلاً تال ٹھوک کے، انڈیا کیا کہتا ہے، راج دھرم، سنویدھان کی شپتھ، ماسٹر اسٹروک، پرائم ٹائم وغیرہ۔ سوائے چند کے اکثر Debate show میں ہندو مسلم کے موضوع پر بحث کی جاتی ہے۔ طے شدہ مدعوں کی گفتگو بھی ہندو مسلم پر ختم ہوتی ہے۔ شو میں تشریف لائے مہمانان بحث کے دوران اس قدر جذباتی ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنے عہدے تک کا خیال نہیں

رہتا۔بعض اوقات وہ بھول جاتے ہیں کہ انہیں نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر ممالک کے لوگ بھی سنتے رہتے ہیں۔ایسے حالات میں سنجیدہ ناظرین ٹی وی آف کر کے دیگر کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

وہیں اگر بات کریں دو رُخ کی تو زبان کی نفاست، نزاکت اور لطافت کے ساتھ میزبان اینکرز بڑی ہنرمندی اور سلیقے سے اپنے مہمانان کا تعارف پیش کرتے ہوئے اپنے پہلے سوال کے ساتھ بحث کی شروعات کرتے ہیں۔عموماً یہاں چیخنے چلانے کے واقعات کم پیش آتے ہیں۔جس سے موضوع کو سمجھنے اور غور وفکر کرنے میں سامعین کو کافی مدد ملتی ہے۔

اس شو میں تشریف لانے والے اہم حضرات میں میم افضل، شاہ نواز حسین، تحسین پونا والا، شہزاد پونا والا، مولانا نعمانی، مولانا انصار رضا وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ دو رُخ میں ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیوں کے رہنما اور نمائندے شامل ہوتے ہیں۔

'دو رُخ' کی ایک اچھی بات یہ ہے کہ اینکرز حضرات مقررین کی گفتگو کے درمیان زیادہ دخل اندازی نہیں کرتے، جیسا کہ دیگر چینلس پر ہوتا ہے۔اس شو کے اینکرز اپنے مہمانان سے دوٹوک سوال کرتے ہیں اور ان کے جوابات کو سیدھے سامعین تک پہنچاتے ہیں۔وزیر اعظم نریندر مودی کا ''سب کا ساتھ سب کا وکاس'' جملے کا تجزیہ کرنے کے لیے جمع مہمانان میں بی جے پی کے ترجمان شاہ نواز حسین اور کانگریس کی ترجمانی سینیر رہنما میم افضل کے پروگرام میں اینکر کا یہ جملہ قابل غور ہے۔وہ کہتے ہیں:

''جیسا کہ میں نے کہا، سیاست کا دو رُخ، ایک رُخ حکومت کا ہے اور ایک رُخ حزب اختلاف کا ہے۔اور اس رُخ میں میرا اپنا کوئی رُخ نہیں ہے، تیسرا رُخ آپ کا ہے۔آپ کو ان دو رُخوں کے درمیان سے اپنا ایک رُخ طے کرنا ہے۔جو تیسرا رُخ ہوگا وہی جمہوریت کا رُخ ہے۔'' (نیوز ۱۸ اردو، ۳۱ جنوری، ۲۰۱۸، یوٹیوب)

اس طرح کے ڈیبیٹ جمہوریت اور ملک کی سالمیت کے لیے کافی فائدہ مند ہوتے ہیں۔اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کے ایسے چینلس زبان کی بقا کے ساتھ جمہوریت کی حفاظت کے لیے بھی کارآمد ہیں۔

ساغراعظمی

غزل

کون کہتا ہے محبت کے لیے ہوتے ہیں
اب تو رشتے بھی ضرورت کے لیے ہوتے ہیں

آکے بونے مری بستی میں بسے ہیں جب سے
روز جھگڑے قد وقامت کے لیے ہوتے ہیں

مجھ کو یہ حکم ملا ہے کہ میں تسلیم کروں
پھول کانٹوں کی حفاظت کے لیے ہوتے ہیں

خون جب دے کے بھی قیمت نہ پسینے کی ملے
ایسے حالات بغاوت کے لیے ہوتے ہیں

قاتلو تم بھی ذرا جا کے سجاؤ مقتل
ہم بھی تیار شہادت کے لیے ہوتے ہیں

لوگ کرتے ہیں محبت تو غلط بھی کیا ہے
آپ جیسے ہی محبت کے لیے ہوتے ہیں

عزم، خودداری، انا، دوستی، اخلاق، وفا
اب یہ آئینے تجارت کے لیے ہوتے ہیں

اس نے دیکھا ہے محبت سے سنبھلنا ساغر
ایسے لمحات عبادت کے لیے ہوتے ہیں

احمد نور عینی۔ پی ایچ ڈی اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

ریاستِ مدینہ کا آئین اور اسلامی شہریت کی بنیادیں

مدینہ میں اسلامک اسٹیٹ قائم ہونے کے بعد آپ ﷺ نے جو دستور ترتیب دیا تھا، اس میں اسلامی شہریت کے اُصول بجا طور پر ہمیں ملتے ہیں، دستورِ مدینہ کا اگر یہ غور جائزہ لیا جائے تو ہمیں شہریوں کی دو قسمیں نظر آتی ہیں: ایک وہ جنھیں شہریت حاصل کرنے کے لئے معاہدے کی ضرورت پڑی تھی، یعنی غیر مسلم شہری اور دوسرے وہ جنھیں حصولِ شہریت کے لئے کسی معاہدے کی ضرورت نہیں پڑی، یعنی مسلم شہری، پھر مسلم شہری دو طرح کے تھے، ایک وہ جو مدینہ کے پیدائشی شہری تھے، یعنی انصار اور دوسرے وہ جو اکتسابی شہریت کے حامل تھے، یعنی مہاجرین۔ یہاں دستور کی ان بعض دفعات کا ذکر کیا جارہا ہے جن سے اسلامی نظامِ شہریت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

○ دستور کی دفعہ ۳۶ (الف) کے تحت یہ حکم ہے کہ کوئی بھی شخص حضور ﷺ کی اجازت کے بغیر فوجی کاروائی کے لئے مدینہ سے باہر نہ نکلے، اس دفعہ کے الفاظ ہیں:

وأنه لا يخرج منهم أحد إلا بإذن محمد۔ (الوثائق السياسية، ڈاکٹر حمید اللہ: ۶۱)

اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی شخص محمد (ﷺ) کی اجازت کے بغیر باہر نہیں جاسکتا۔

شارحین دستور نے اس خروج سے فوجی کاروائی کے لئے باہر نکلنا مراد لیا ہے، (دیکھئے: رسول اللہ ﷺ کی حکمرانی وجانشینی، ڈاکٹر حمید اللہ: ۶۴، سیرۃ الرسول کی آئینی ودستوری اہمیت، ڈاکٹر طاہر القادری: ۵۱) یہاں یہ بات وضاحت کی محتاج نہیں ہے کہ سیاستِ خارجہ کے باب میں جنگی مہم جوئی جس طرح ایک نازک مسئلہ ہے اسی طرح سیاستِ داخلہ کے باب میں غیر ملکیوں کا مملکت کی مستقل شہریت اختیار کرنا ایک اہم مسئلہ ہے، اس لئے اس دفعہ پر قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ مدینہ میں آ بسنے والوں کے لئے بھی یہ دفعہ لگائی جاتی کہ کسی بھی شخص کو حضرت محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر مدینہ کا مستقل باشندہ بننے کی اجازت نہیں ہے؛ لیکن اس کے برخلاف یہ کہا گیا کہ جو کوئی شخص (اسلام قبول کرکے) مدینہ کے مسلمان شہریوں کی تابع داری اختیار کرے، پھر (ہجرت کرکے) ان کے ساتھ آ ملے وہ سیاسی وحدت کا ایک فرد ہوگا، یعنی مملکت کا ایک شہری ہوگا؛ چناں چہ دستور کی دفعہ: ا میں اس کی صراحت ہے:

هذا كتاب من محمد النبي بين المؤمنين والمسلمين من قريش وأهل يثرب ومن تبعهم فلحق بهم وجاهد معهم، أنهم أمة واحدة من دون الناس۔ (الوثائق السياسية: ۵۹)

یہ ایک حکم نامہ ہے نبی اور اللہ کے رسول محمد کا قریش اور اہل یثرب میں ایمان لانے والوں اور ان لوگوں کے مابین جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہو جائیں اور ان کے ہم راہ جنگ میں حصہ لیں، تمام (دنیا کے) لوگوں کے

بالمقابل ان کی ایک علاحدہ سیاسی وحدت ہوگی۔

دستور کی مذکورہ بالا دفعہ کا اطلاق مدینہ کے ان خوش نصیب مہاجرین و انصار پر تو ہوگا ہی جو دستور ترتیب دیئے جانے کے وقت مملکت مدینہ کے شہری تھے، مگر ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں پر بھی ہوگا جو ان مہاجرین وانصار کی پیروی کریں، پھر ان کے ساتھ آملیں؛ لہٰذا ہر وہ مسلمان جو ان مہاجرین و انصار کی پیروی کرے، پھر ان کے ساتھ آملے وہ سیاسی وحدت کا ایک فرد یعنی مملکت مدینہ کا ایک شہری شمار ہوگا، یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ محققین کے نزدیک دستورِ مدینہ کی ابتدائی ۲۳ دفعات کا تعلق صرف مہاجرین و انصار سے ہے؛ کیوں کہ یہ دفعات جس وقت ترتیب دی گئیں اس وقت مملکتِ مدینہ کی شہریت صرف مہاجرین و انصار کو حاصل تھی، بعد میں دیگر غیر مسلم یہودی قبائل کے ساتھ معاہدہ کرکے ان کو اسلامی مملکت کا شہری بنایا گیا، (دیکھیے: رسول اللہ ﷺ کی حکمرانی اور جانشینی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ :۵۱، محاضراتِ سیرت، ڈاکٹر محمود غازی: ۳۳۸) اس لیے دفعہ ایک کے ان الفاظ: ''ومن تبعھم فلحق بھم'' کا تعلق قبائل انصار کے مشرک افراد سے نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ وہ قبائل کے نقباء (نمائندگان) کے ایمان قبول کرنے کی وجہ سے تبعاً مدینہ کے شہری تھے اور نہ ہی ان الفاظ کا تعلق یہودیوں سے ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ دفعہ: ۱۶ میں ان کے لیے اس بات کا مستقل تذکرہ کیا گیا ہے، اس لیے غالب گمان یہی ہے کہ اس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو مسلمانانِ مدینہ کے دین کو اپنائیں اور ہجرت کرکے ان سے جاملیں کہ اس طرح وہ مملکت مدینہ کے شہری بن جائیں گے۔

ان دفعات میں اس بات کا واضح اشارہ موجود ہے کہ مسلمانوں کو مملکتِ اسلامیہ کی سیاسی وحدت کا فرد بننے کے لئے کسی عقد کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ غیر مسلموں کو حصولِ شہریت کے لئے عقد ومعاہدے کی ضرورت ہے، یہی وجہ ہے کہ جو کوئی بھی مسلمان ہوکر مدینہ آیا اسے شہریت کے لئے کوئی عقد نہیں کرنا پڑا، اس کے برعکس ان ہی غیر مسلموں کو مملکت مدینہ کی شہریت دی گئی، جنھوں نے مملکت سے اس کا معاہدہ کیا۔

○ دستور کی دفعہ: ۱۷ کے مطابق تمام مسلمانوں کی صلح ایک ہی ہوگی، دفعہ کے الفاظ ہیں :

وإن سلم المؤمنين واحدة: (حوالۂ سابق: ۶۰)

اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی۔

اس وحدت صلح کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کوئی ایک صلح کرلے تو سب پر اس کی پابندی ضروری قرار پائے؛ چوں کہ جنگ کی حالت میں کسی مسلمان کا دشمن سے صلح کرنا مملکت کی مصلحت کے خلاف ہے، اس لئے یہ حکم دیا گیا کہ جب تک صلح تمام مسلمانوں کے مفاد میں نہ ہو اس وقت تک صلح نہ کی جائے؛ چنانچہ اسی دفعہ میں یہ الفاظ بھی بڑھائے گئے :

اللہ کی راہ میں لڑائی ہو تو کوئی ایمان والا کسی دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر (دشمن سے) صلح نہیں کرے گا، جب تک کہ یہ صلح ان سب کے لئے برابر اور یکساں نہ ہو۔ (الوثائق السیاسیة: ۶۰-۷، رسول اللہ ﷺ کی حکمرانی وجانشینی: ۶۲)

جب کہ غیر مسلموں کی شہریت کے باب میں ہمیں صلح ومعاہدہ کی وحدت کا یہ رنگ نظر نہیں آتا، یہی وجہ ہے کہ بنو قینقاع نے جب معاہدہ شکنی کی تو صرف ان ہی کو جلاوطن کیا گیا، بنونضیر اور بنوقریظہ کے معاہدہ کو برقرار رکھا گیا اور بنونظیر نے جب عہد کی پامالی کی تو صرف ان ہی کا محاصرہ کیا گیا، بنوقریظہ پر کسی بھی طرح کی آنچ آنے نہ دی گئی؛ لیکن جب بنوقریظہ نے بھی غداری کی تو انھیں بھی مار بھگایا گیا۔ دستور نبوی کی مذکورہ بالا دفعہ اور یہودی قبائل سے متعلق سیرت نبوی کا یہ روشن پہلو اس بات پر دال ہیں کہ غیر مسلموں کی صلح اور ان سے کئے جانے والے معاہدے قبائل اور علاقوں کی بنیاد پر تو ہوسکتے ہیں؛ لیکن

مسلمانوں کی صلح صرف اور صرف اسلام کی بنیاد پر استوار ہوگی ---افسوس کہ مروجہ نظام شہریت کے وضعی قوانین کو اپنانے کی وجہ سے مسلمانوں کی صلح اور ان کے معاہدے جو کبھی آفاقی تھے، اب مملکت کی حدود تک سمٹ آئے ہیں۔

○ دستورِ مدینہ میں جن غیر مسلموں کو حقوق دیئے گئے ہیں، ان کے قبائل کا نام بہ نام تذکرہ بھی کردیا گیا ہے، (دیکھئے: دفعہ: ۲۵-۲۳، الوثائق السياسية :۶۱) کیوں کہ یہی وہ قبائل تھے، جنھوں نے معاہدہ کے ذریعہ حق شہریت حاصل کیا تھا: اس کے برخلاف مسلمانوں کو ایک جسدِ واحد قرار دیا گیا ہے ؛ چنانچہ دفعہ:۱۵ میں ہے :

وإن المؤمنين بعضهم موالي بعض دون الناس۔(الوثائق السياسية:۶۰)

اور ایمان والے باہم بھائی بھائی ہیں (ساری دنیا) کے لوگوں کے مقابل۔

وإن سلم المؤمنين واحدة۔(حوالۂ سابق)

اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی۔

اور بعض دفعات میں تو ''جمیعاً'' اور ''کافۃً'' کے تاکیدی الفاظ لاکر حق شہریت کے اس مسئلہ کو بالکل واضح کردیا گیا، جیسا کہ دفعہ:۱۳ کے الفاظ ہیں :

وأن المؤمنين المتقين أيديهم على كل من بغى منهم أو ابتغى دسيعة ظلماً أو إثماً أو عدوانا أو فسادا بين المؤمنين وأن أيديهم عليه جميعاً ولو كان ولد أحدهم۔(حوالۂ سابق)

اور متقی ایمان والوں کے ہاتھ ہر اس شخص کے خلاف اٹھیں گے جو ان میں سرکشی کرے یا استحصال بالجبر کرنا چاہے یا گناہ یا تعدی کا ارتکاب کرے یا ایمان والوں میں فساد پھیلانا چاہے اور ان کے ہاتھ سب مل کر ایسے شخص کے خلاف اُٹھیں گے، خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

اور دفعہ:۲۱ میں ہے :

وأن المؤمنين عليه كافة ولا يحل لهم إلا قيام عليه۔(حوالۂ سابق:۶۱)

اور تمام ایمان والے قاتل کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اس کے سوا انھیں کوئی اور چیز جائز نہ ہوگی۔

دستور کی مذکورہ بالا دفعات یہ صراحت کرتی ہیں کہ انھی غیر مسلموں کو حق شہریت حاصل ہوگا، جن کا مملکت کے ساتھ معاہدہ ہو (جسے فقہ کی اصطلاح میں 'عقد ذمہ' کہا جاتا ہے) ، اس کے برخلاف مسلمانوں کے حق شہریت کی بنیاد اسلام ہے، تمام مسلمان دارالاسلام کے برابر درجہ کے شہری ہیں ، تمام کو یکساں حق شہریت حاصل ہے اور تمام کے حقوق بھی یکساں ہیں اور فرائض بھی، علاقہ وقبائل کا اختلاف ان کے حقوق وفرائض کو مختلف نہیں کرسکتا۔

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی وغیراقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد

زیرانتظام : شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
AcN: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

بانی وناظم: مولانا ڈاکٹر مفتی محمد حامد ہلال اعظمی۔ موبائل: 9392533661

آصفیہ شمیم۔ ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد

مجروح سلطان پوری ایک غزل گو شاعر

مجروح سلطان پوری کا اصل نام اسرار حسن خاں ہے۔ ان کے والد کا نام محمد حسین خاں انگریزی فوج میں ملازم تھے۔ ان کی چھ اولادیں تھیں، مجروح پانچویں اولاد تھے، مجروح کا آبائی وطن قلع سلطان پور تھا، ان کی پیدائش ۱۴ راگست ۱۹۱۵ء کو ہوئی، ان کی ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں ہوئی۔ فیض آباد میں انہوں نے صرف ونحو، فقہ وحدیث اور تفسیر کی تعلیم حاصل کی۔ الہ آباد یونیورسٹی کے امتحانوں میں مولوی عالم اور مولوی فاضل کی خانگی طور پر تیاری کی اور دونوں امتحانوں میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ جا کر طب کی سند حاصل کی اور اپنا مطب کھول کر پریکٹس کرنے لگے۔

شاعری کا آغاز اور ارتقاء:

اسی زمانے میں انہیں شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے پہلی غزل کہی، جس کا مطلع یہ تھا ؎

چشم تر لب خشک آہ و زاریاں
رنگ پر ہیں ان کی فتنہ کاریاں

یہ غزل انہوں نے سلطان پور کے اس مشاعرے میں سنائی تھی، جس پر انہیں سب سے زیادہ داد ملی، اس طرح سلطان پور کے اس مشاعرے سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔ شاعری سے اس لگاؤ نے انہیں پیشہ طبابت سے دور کردیا۔ مجروح نے اپنی ابتدائی نظموں اور غزلوں پر مولانا آس لکھنوی سے صلاح لی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں جونپور کے ایک مشاعرے میں ان کی ملاقات جگر مرادآبادی سے ہوئی، انہوں نے مجروح کی حوصلہ افزائی کی۔ جگر کی فیضِ محبت سے مجروح نے فائدہ اٹھایا، جگر کا ان کی ذہنی تربیت میں بڑا حصہ رہا، جگر نے انہیں مشاعرہ لوٹنے والی سطحی قسم کی شاعری سے روکا، جگر کی ہدایت تھی کہ کسی شاعر کی تقلید نہ کی جائے، مجروح جگر کا بے حد احترام کرتے تھے اور انہیں اپنا استاد مانتے تھے۔

۱۹۴۵ء میں ممبئی میں ایک بڑا مشاعرہ منعقد ہوا، اس میں جگر کے ساتھ سلطان مجروج بھی شریک ہوئے۔ اس مشاعرے میں فلم ڈائرکٹر اے، آر، کاردار بھی شریک تھے، انہوں نے جگر صاحب سے اپنی فلم ''شاہ جہاں'' کے گیت لکھنے کی فرمائش کی، جگر صاحب نے معذرت چاہی اور مجروح کو پیش کردیا۔ جگر صاحب ہی کے مجبور کرنے پر مجروح نے یہ کام قبول کرلیا اور یہی ان کا مستقل ذریعہ معاش بن گیا۔ اب وہ مستقل طور پر ممبئی آگئے۔ ایک گیت کار کی حیثیت سے ان کی شہرت ملک کے کونے کونے تک پھیل گئی، فلمی گیت کار کی حیثیت سے شاندار خدمات انجام دینے پر انہیں گراں قدر دادا صاحب پھالکے ایوارڈ ادبی خدمات کے صلے میں اقبال سمان سے نوازا گیا۔

مجروح کی شاعری کو تین دور میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور: ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۴ء۔ اس دور کی شاعری میں وہ اپنے انداز کی عشقیہ غزلیں لکھیں، چونکہ مجروح جگر سے متاثر تھے، اس لیے ان کی غزل کا قافیہ بدل کر خود بھی غزل کہی ۔

کام آخر جذبہ بے اختیار آہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آہی گیا

جگر کی اس غزل کے قافیہ کو بدل کر مجروح نے اس یہ غزل کہی ؎

کوئی آتش دو سبو، شعلہ یہ جام آہی گیا
آفتاب آہی گیا، ماہِ تمام آہی گیا

پھر ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۵ء میں انہوں نے چند گیت اور گیت نما نظمیں لکھیں، لیکن یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہوگیا اور انہوں نے مستقل طور پر غزل ہی کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

شاعری کا دوسرا دور: ۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۲ء۔ دوسرے دور میں جس کا آغاز ۱۹۴۶ء سے ہوا، اس دور میں مجروح عشقیہ جذبات کے علاوہ زندگی کے دوسرے تجربوں اور خاص طور پر سیاسی مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔ اس دور کا آغاز ان کی اس مشہور غزل سے ہوتا ہے ؎

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

۱۹۴۶ء کی ایک غزل میں انہوں نے آزادی سے قبل کے مخصوص سیاسی حالات کو پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہوا ؎

یہ ذرا دور پہ منزل یہ اجالا یہ سکوں
خواب کو دیکھ ابھی خواب کی تعبیر نہ دیکھ
دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرتا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

مجروح کی یہ غزل اس دور میں بہت مقبول ہوئی، اس طرح مجروح نے بڑے ہی دلکش انداز میں سیاسی مسائل کی پیش کش کے ذریعہ غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا۔

تیسرا دور: ۱۹۵۲ء تا ۱۹۷۵ء۔ مجروح کا مجموعہ کلام ''غزل'' کے نام سے پہلی بار ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ ان کے تیسرے دور کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہو ؎

اہل طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو، بھنور کو چشم جانا نہ کہیں
آہی جائے گی سحر، مطلع امکاں تو کھلا
نہ سہی باب قفس روزنِ زنداں تو کھلا
زباں ہماری نہ سمجھا یہاں کوئی مجروح
ہم کو اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے
ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

اس کے دور کے بعد مجروح نے بہت کم غزلیں کہیں۔

مجروح کی غزل گوئی، چند اہم خصوصیات:

ان کی شاعری میں بھرتی کا یا تیسرے درجے کا کوئی شعر نہیں ملتا۔ مجروح پہلے شاعر ہیں، جنہوں نے غزل کو ترقی پسند نظریہ سے روشناس کیا، انہوں نے غزل کے مزاج کا لحاظ رکھتے ہوئے اشعاروں اور کنایوں کے پردے میں اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کیا ہے، وہ بے ساختہ کسی ایسے منظر کی تصویر کھینچ دیتے ہیں جو پڑھنے والوں کو مصوری کا لطف دے جاتے ہیں۔ مثلاً ؎

وہ لے جائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اڑی زلف چہرے پر اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے
جفا کے ذکر پہ تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمہاری بات نہیں بات ہے فسانے کی

مجروح کی شاعری میں طنز کا پہلو ایک ایسا لطیف وصف ہے، جسے محسوس کئے بغیر نہیں دیا جاسکتا۔ مثلاً ؎

مجروح لکھ رہے وہ اہلِ وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

مجروح کی شاعری مشاہیر ادب کی نظر میں:

ڈاکٹر محمد حسن مجروح کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مجروح کی شاعری میں حیات اور کائنات کے تسلسل

کا احساس اور تاریخی قوتوں کی کارفرمائی کا تصور پایا جاتا ہے۔ ان کے ہاں زندگی سے مراد انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی زندگی ہے۔ مجروح کے لہجے کی جھنکار میں دردمندی ہے، مایوسی نام کی کوئی چیز نہیں۔ مجروح بلاشبہ غزل کی کلاسیکی لہجے کے مزاج داں ہیں اور جس طرح وہ سجا کر اور سنوار کر غزل کہتے ہیں، وہ انہیں کا حصہ ہے انہوں نے اس سجاوٹ کو اور نکھار کو لاتعداد تراکیب تراش کر اور نئی نغمگی سے بھرپور مرقع مرتب کر کے سجایا ہے"۔

قاضی عبدالغفار مجروح کے کلام کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مجروح اپنے افکار میں بزم کو رزم سے ملائے ہیں وہ تقلید سے بچ کر اپنی محفل الگ آراستہ کرتے ہیں، ان کا کلام شیخی اور گھمنڈ کی آلودگی سے پاک رہتا ہے۔

سردار جعفری نے مجروح کی غزل کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"مجروح نے اپنی غزل کو نئے خیالات، احساسات، سماجی کشمکش کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے، انہوں نے سماجی اور سیاسی موضوعات کو بڑی کامیابی کے ساتھ غزل کے پیرائے میں ڈھال لیا ہے"۔

ڈاکٹر اعجاز حسن لکھتے ہیں:

"مجروح نے اپنے سیاسی وسماجی محسوسات کو اس حسن سے غزلوں میں پیش کیا ہے کہ کسی غزل گو کے یہاں یہ خوبی نظر نہیں آتی۔ ان کے کلام میں مریضانہ ذہنیت کا نام نہیں، اس کے برخلاف ایک مردانہ للکار اور ہمت افزاء پکار ہے"۔

جدید اور قدیم کا میل اور امتزاج مجروح کی غزل کا بہت بڑا حسن ہے۔ مجروح کی غزل ان کی شخصیت اور عہد دونوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ مجروح کا شمار جدید اردو غزل کے صفِ اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ ۲۰۰۰ء کو اردو غزل کا یہ چراغ گل ہوگیا۔

صفی الرحمٰن صفی۔ پورہ معروف مئوناتھ بھنجن (یوپی)

غزل

لرزاں ہیں مرے ہونٹ بدن کانپ رہا ہے
لب کیسے میں کھولوں کہ سخن کانپ رہا ہے

کیا بات ہے کیوں میرا وطن کانپ رہا ہے
خطرے میں ہے گاندھی کا چلن کانپ رہا ہے

جلتا ہے مکاں اور مکیں چیخ رہے ہیں
وہ ظلم کہ اب چرخِ کہن کانپ رہا ہے

اب اس پہ خدا جانے ہے کس شخص کا سایہ
مرجھائے سبھی گل ہیں چمن کانپ رہا ہے

جو حق کے ہیں دیوانے وہ چڑھ جاتے ہیں ہنس کر
تو سن کے فقط دار و رسن کانپ رہا ہے

آیا تھا مرے ذہن میں تھوڑا سا تکبر
اس روز سے اب تک مرا فن کانپ رہا ہے

وہ لوگ کہیں کھو گئے جن کو یہ کہا تھا
"کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے"

دو بھائی کے جھگڑا نہ کرے صحن میں دیوار
آنگن کا اسی بات پہ من کانپ رہا ہے

اس دور میں ہوتی ہے اب اس طرح خیانت
سن سن کے صفی لفظِ غبن کانپ رہا ہے

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے دفتر میں اے آئی ایم آئی ایم بہار کے صدر
اختر الایمان کی آمد

ہندوستان کے سیاسی حالات پر مذاکرہ

مولانا ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی

(ایڈیٹر ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد کی دعوت پر شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کے دفتر میں مجلس اتحاد المسلمین کے معروف اور ہر دلعزیز قائد و سابق ایم ایل اے کشن گنج عالی جناب اختر الایمان صدر اے آئی ایم آئی ایم بہار تشریف لائے ان کے ساتھ، عادل بھائی یوتھ کے پریسڈنٹ مجلس اتحاد المسلمین بہار رہے۔ اس موقع پر سیمانچل سے تعلق رکھنے والے علماء اور اماموں کو چائے نوشی کی دعوت دی گئی۔ اختر الایمان کا استقبال شال پوشی و گل پوشی کے ذریعہ کیا گیا۔ ایک دوسرے سے متعارف ہونے کے بعد مذاکرات کا سلسلہ جاری ہوا۔ اختر الایمان نے کہا کہ ہمیں اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے ہمیں انضمام کی سیاست نہیں، بلکہ حکومت میں اور ہر جگہ اشتراک چاہئے، اس لیے کہ ہمیں ہر جگہ پسماندہ کیا جاتا ہے، ہمیں ڈرا ڈرا کر ووٹ لیا جاتا ہے اور جیت کے بعد حاشیہ پر بھی نہیں رکھا جاتا ہے، انہوں نے جنوب کی ریاست کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ کیرلا تمل ناڈو، کرناٹک، تلنگانہ وغیرہ میں یہاں کے مسلمان باشعور ہیں اور کسی نہ کسی طرح سے ہمارے قائدین اس میں اہم کردار ادا کرتے ہیں بالخصوص اسدالدین اویسی صاحب اور کیرالا کے قائدین کی طرف اشارہ کیا انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہندوتوا کو جو کہ اس وقت بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے، اسے اپنے اخلاق، محبت، خدمت خلق سے کم کیا جا سکتا ہے اس میں علماء اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، انہوں نے اپنے حلقے کی پسماندگی کو پوری کوشش سے ختم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور یہ بھی کہا کہ جیت ہار کی پرواہ کیئے بغیر مسلسل کوشش جاری رکھوں گا۔ اللہ سے امید ہے کہ ضرور کامیابی ملے گی۔

اس اہم موقع پر مفتی محمد عمیر، شیراز احمد، ابو ہریرہ یوسفی، مولانا منتظم، مولانا محمد اکرام الدین، مولانا غلام مصطفیٰ، مولانا نبیل طیب وغیرہ موجود تھے اور ان کی خدمت میں ''صدائے شبلی'' کا تازہ شمارہ پیش کیا گیا حاضرین نے بیرسٹر اسدالدین اویسی کی جرات اور بیباکی کو سلام کیا اور اختر الایمان صاحب کے لیئے دعا کی گئی اور ہر ممکنہ خدمات کی پیشکش کی گئی۔ مہمان اور میزبان کے شکریہ کے ساتھ یہ اہم میٹنگ اختتام کو پہنچی۔

آل انڈیا صوفی علماء کونسل کے ایک وفد نے کے ٹی آر سے مل کر ٹی آر ایس کی کامیابی اور ان کے صدر بنائے جانے پر مبارکباد پیش کی اور اوقافی جائداد کے تحفظ وغیرہ پر اپنے مطالبات کو پیش کیا، اور صدائے شبلی کا تازہ شمارہ بھی پیش کیا گیا۔ اس موقع پر کونسل کے صدر صوفی خیر الدین، نائب صدر مولانا ڈاکٹر محمد مجاہد بلال اعظمی، صوفی امان اللہ خان، محترمہ نسیم بیگم و دیگر موجود تھے۔ (نمائندہ محمد اکرام الدین کا کرتوی)

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرس گولڈ میڈلسٹ اردو ماس سوسائٹی فار پیس کی جانب سے اردو انمول رتن ایوارڈ سے سرفراز ہوتے ہوئے

شفیق الرحمٰن صدیقی۔ پورہ معروف مئو (یوپی)

تذکرہ: آزادئ ہند کے ایک گمنام مجاہد کا

غلام ہندوستان کو انگریزوں کے آہنی پنجوں سے آزاد کرانے کے لیے ہمارے جن بزرگوں اور رہنماؤں نے حصہ لیا، ان میں سے ایک تھے حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ۔ آپ بیک وقت ایک کامیاب مدرس، بہترین مصنف، شیریں بیاں مقرر اور خطیب تھے، اسی کے ساتھ میدان سیاست کے سرگرم رکن تھے، حب الوطنی آپ کے ریشے ریشے میں سمائی ہوئی تھی، وطن کو انگریزوں سے آزاد کرانے کی کوشش کی، جن کی بنا پر آپ کو پانچ مرتبہ جیل کی ہوا کھانی پڑی، پھر بھی آپ کی جدوجہد اور آزادی کی کوششوں میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی۔

آپ کی ولادت باسعادت دیوبند کے قدیم خاندان سادات رضویہ میں ۱۲رجب ۱۳۲۱ھ مطابق ۴؍اکتوبر ۱۹۰۳ء محلّہ پیرزادگاں قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۶ء میں دارالعلوم کے درجہ فارسی میں داخلہ لیا اور بہت جلد علوم عقلیہ ونقلیہ میں مہارت حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۶ء میں فارغ التحصیل قرار دیے گئے۔

آپ نے جن اساتذہ باکمال سے فیض اٹھایا، ان میں علامہ انورشاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی اعظم عزیزالرحمٰن عثمانیؒ، شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہویؒ، عارف باللہ مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ اور امام المعقولات حضرت مولانا غلام رسول ہزارویؒ ہیں۔ یہ سب کے سب اپنی مثال آپ تھے، ورع وتقویٰ، توکل واستغناء اور قناعت پسندی جیسے اعلیٰ روحانی صفات سے متصف تھے، جو ولیوں، درویشوں، فقیروں، صوفی اور سنتوں کا شعار رہا ہے۔

فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ شاخ مدرسہ حنفیہ آرہ شاہ آباد میں درس وتدریس کی خدمات انجام دینے لگے۔ ساڑھے تین سال تک آپ کے طالبان کو فیض پہنچانے کے بعد مستعفی ہوگئے۔ کیونکہ اس مدرسہ کو سرکاری امداد ملتی تھی اور بہار یونیورسٹی کے درجات فاضل کی تیاری بھی یہاں کرائی جاتی تھی۔ یہ دونوں باتیں دارالعلوم دیوبند کے اصول اور ڈسپلن کے خلاف تھیں، اگر آپ استعفیٰ نہیں دیتے اور کچھ عرصہ انتظار کرلیتے تو شمس الہدیٰ پٹنہ میں پروفیسر ہوجاتے اور اس کے بعد پرنسپل بھی ہوجاتے۔

جمعیۃ علماء ہند کے فلیٹ فارم سے قومی وملی خدمات:

یوں تو آپ کی پوری زندگی قوم کے لیے وقف تھی اگر ان سب کا جستہ جستہ احاطہ کیا جائے تو ایک ضخیم جلد تیار ہوجائے گی، صرف اجمالی طور پر آپ کے ان کارناموں اور مجاہدوں کا ذکر کروں گا، جو آپ نے کانگریس اور جمعیۃ کے پلیٹ فارم سے انجام دیئے۔

(۱) ۱۹۳۲ء میں جب تحریک سول نافرمانی عروج وشباب پر تھی، پورے ملک میں سول نافرمانی اور قانون شکنی کے نظام کو زندہ رکھنے کے لیے کانگریس نے ''جنگی کونسل'' اور جمعیۃ العلماء ہند نے ''ادارہ حربیہ'' قائم کیا، جس کے ناظم حضرت مولانا ابوالمحاسن سجادؒ تھے۔ ان کے حکم کے مطابق آپ ہر ہفتہ

جمعہ کی صبح مرادآباد سے پیدل چل کر دہلی پہنچ جاتے اور جمعہ کے بعد تقریر کر کے واپس ہو جاتے، اس انتہائی ہوشیاری اور کمال احتیاط سے چند جمعے گزرے، پھر ایک جمعہ کو پولیس کی حراست میں آ گئے۔ ایک ہفتہ حوالات میں رکھ کر چھوڑ دیئے گئے اور چھ ماہ کے لیے دہلی میں داخلہ پر پابندی لگا دی گئی۔

اس موقع جمعیۃ العلماء ہند نے ڈکٹیٹر شپ کا نظام قائم کیا تھا، جس کے آپ نویں ڈکٹیٹر اور نیز اتر پردیش کانگریس کمیٹی کے بھی ڈکٹیٹر ہونے کا شرف حاصل کیا تھا۔

سول نافرمانی ۱۹۳۲ء کا ذکر کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

''احقر دہلی سے رہا ہو کر دیوبند پہنچا، پھر وہاں سے مرادآباد چلا گیا، جہاں صوبہ کانگریس کمیٹی کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے گرفتاری کا پروگرام تھا۔ سی آئی ڈی احقر کی تلاش میں تھی۔ جب احقر اچانک مرادآباد کے چوک بازار میں اس حالت میں نمودار ہو گیا کہ ایک ہاتھ میں کانگریس کا جھنڈا تھا تو دوسرے ہاتھ میں جمعیۃ العلماء ہند کا۔ ایک عزیز دوست پنجابی سوداگر حافظ محمد شفیع نے آگے بڑھ کر سہرا ہار گلے میں ڈالا، جس کو احقر نے فوراً منظور کر لیا۔ چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ حاضرین کے اجتماع نے جلوس کی شکل اختیار کر لی اور اب یہ جلوس جس کی قیادت محمد میاں کر رہا تھا، امروہہ گیٹ کی طرف بڑھنے لگا، ابھی تقریباً ایک فرلانگ چلا تھا کہ پولیس کے دستہ نے آ کر محاصرہ کر لیا اور اس کے افسر نے گرفتاری کا وارنٹ دکھایا۔ ایک طالب علم مولانا محمد مرزا میرٹھی، جو اس وقت مرادآباد شاہی میں پڑھ رہے تھے، نہایت جوشیلے تھے، ان سے ضبط نہ ہو سکا اور جوش میں آ کر ایک طمانچہ رسید کیا''۔

(۲) ۸/اگست ۱۹۴۲ء کو انڈین نیشنل کانگریس نے ''کوئٹ انڈیا'' (انگریز ہندوستان چھوڑو) کی تجویز پاس کی، جس کی پاداش میں رہنمایانِ وطن کی داروگیر کا سلسلہ شروع ہو گیا، اس اقدام کی حمایت کے لیے جمعیۃ العلماء ہند کے ناظم عمومی مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری (متوفی ۱۹۶۲ء) کو دہلی میں بصدارت سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلی نائب صدر جمعیۃ العلماء ہند منعقد ہوا۔

آپ راستے کی تمام تر صعوبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرتے ہوئے بحیثیت مدعو خصوصی مجلس عاملہ کے اجلاس میں شریک ہوئے، مجلس عاملہ نے انڈین نیشنل کانگریس کے اقدام کی حمایت کرتے ہوئے ایک تجویز پاس کی اور یہ طے ہوا کہ اس کو کثیر تعداد میں چھپوا کر ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا جائے۔ یہ کام مولانا محمد میاںؒ اور مولانا عبدالماجد دہلوی کے ذمہ قرار پایا۔ دہلی سے لے کر مشرقی ہندوستان کے آخری کنارے تک پہنچانا مولانا محمد میاںؒ کے ذمہ کیا گیا۔ حسبِ ہدایت اراکین عاملہ تجویز اور اعلان کا بنڈل لے کر کلکتہ روانہ ہو گئے۔

(۳) تحریک ۱۹۴۲ء کے موقع پر گرفتار شدہ بزرگوں کی جانب سے آپ وقتاً فوقتاً باغیانہ سرکلر جاری کیا کرتے تھے، ایک سرکلر جو سراسر باغیانہ تھا، اس کے پشاور کالج کے طلبہ نے پشتو میں ترجمہ کر کے شائع کیا اور آپ کا نام بھی لکھ دیا، جس کی پاداش میں گرفتار ہوئے اور اکتوبر ۱۹۴۲ء تا اپریل ۱۹۴۴ء مرادآباد اور بریلی کے جیلوں میں رہے۔

(۴) ہنگامہ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ علاقے جو مسلمانوں کی آبادی سے خالی ہو کر کمزور ہو گئے تھے، ان علاقوں کے بچے کھچے مسلمانوں کو ارتداد سے بچانے کے لیے مولانا مرحوم نے انتھک جدوجہد کی اور ہماچل پردیش، راجستھان اور میوات کے پہاڑی و ریگستان علاقوں میں دن و رات دورے کیے، ان کو ڈھارس بندھائی، دینی مکاتب قائم کیے، مجدد الف ثانیؒ کے مزار کو شرنارتھیوں سے محفوظ رکھنا آپ ہی کا کارنامہ ہے۔

(۵) آزادی کے بعد فوراً نئی نسلوں میں دین کی حفاظت کا کام بنیادی تھا۔ جمعیۃ العلماء ہند نے اپنے سولہویں اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۱۶/تا ۱۸/اپریل ۱۹۴۹ء میں دینی تعلیم کی

مولوی محمد حبیب الرحمٰن۔ حیدرآباد

کرنے کا کام:
ابدی عذاب سے بچنے کی کوشش کرنا ہے

سب سے پہلے ایمان (فکر وعقائد) کی درستگی قرآن کی روشنی میں اور اعمال کی اصلاح سنتِ رسول (احزاب ۲۱) اور سبیل المومنین (اصحاب رسول کا طریقہ، انساء ۱۱۵) کی روشنی میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اہل وعیال کو آگ سے بچانے کی کوشش (تحریم ۹)۔ رشتہ داروں اور دوسروں کو ابدی عذاب سے بچنے کے لیے توجہ دلاتے رہنا ہے، تاکہ رب کے حضور عذر پیش کرنے کا موقف حاصل ہو اور وہ خود اپنے بچاؤ کی فکر کریں (اعراف ۱۶۴) اور اپنے وجود کا مقصد پورا کر کے ''خیر امت ہونے کے شرف کے مستحق ہو سکے (آل عمران ۱۱۰)۔ اس طرح تین افراد ہم خیال ہو جائیں تو حکم الٰہی کی تعمیل میں ایک امیر کے تحت زندگی بسر کرنے کی کوشش کی جائے (النساء ۵۹) اور اس کام کو جاری وساری رکھنے کے لیے ''اور تم میں ضرور ایک ایسی جماعت ہو جو خیر کی طرف بلاتی رہے اور بھلائی کے کام کرنے کو کہا کرے اور برے کاموں سے روکا کرے اور ایسا کرنے والے ہی فلاح پائیں گے (آل عمران ۱۱۰)۔

امت واحدہ کو اختلافات سے بچنے کے لیے وہ امور بھی بتا دیئے گئے، جن کے بارے میں ''امر ونہی'' کرنا ہے۔ تمام انسانوں کی اصل ونسل ایک ہی ہونے کی بناء پر ان سب کے لیے جزاء کا قانون بھی صرف ایک یعنی ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'' (البقرہ ۲۸۶)۔ دوسرے ابدی عذاب سے بچنے کی فکر پیدا کی جائے۔ تیسرے ابدی عذاب سے بچنے کا واحد طریقہ بلا شرکت غیرے صرف اللہ ہی کو اکیلا وتنہا تمام مخلوقات کا پروردگار اور حاجت روا ہونے کی حقیقت واقعہ کو نہ صرف ماننا بلکہ یقین کرنا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ زندگی اسی کی اطاعت وفرمانبرداری اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقہ پر بسر کرنے کی کوشش کرنا ہے (ھود ۱۴۰۲، الانبیاء ۱۰۸)۔ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ فرقان کو محمد رسول اللہ پر اسی لیے نازل کیا ہے کہ آپ قیامت تک کے تمام انسانوں کو ابدی عذاب سے خبردار کرنے والے ہوں (فرقان ۱)۔ چنانچہ اللہ کو گواہ بنا کر نبی کریم نے فرمایا کہ میری طرف قرآن اسی لیے وحی کیا گیا ہے کہ میں تم کو ابدی عذاب سے خبردار کروں اور یہ قرآن جس تک بھی پہنچے وہ بھی یہ کام کرے (انعام ۱۹) کتاب اللہ کے ذریعہ ابدی عذاب سے خبردار کرنا نہ صرف صحیح بلکہ معقول طریقہ ہے، اسی لیے تمام پیغمبروں کا طریقہ بھی یہ رہا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا: یتلوا علیھم ایتنا (ہماری آیات پڑھ پڑھ کر سناتے تھے (قصص ۵۹)۔ پروردگار اپنے بندوں کو ابدی عذاب ہی سے خبردار کرنے کے لیے کتابیں نازل فرمایا ہے (قصص ۸۵) اور تمام پیغمبروں کی بعثت کا بنیادی مقصد بھی بندوں کو آخرت کی زندگی کے تعلق سے خبردار کرنا رہا ہے (ص ۴۶)۔ چنانچہ ہر پیغمبر نے اپنی قوم کو ابدی عذاب سے بچنے کا طریقہ ''یقوم اعبلو اللہ مالکم من اللہ غیرہ (اعراف ۵۹)۔ (ترجمہ: اے میری قوم اللہ ہی کی عبادت کرو کیونکہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود (حاجت روا، فریادرس نہیں ہے)۔ بتایا: چنانچہ نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کے پنجتن پاک کی عبادت کرنے سے منع کرتے رہے اور نبی کریمؐ مکہ میں تیرہ سال تک ''یاایھا الناس قولوا الا الہ الا اللہ

تفلحوا (اے لوگو کہو کہ اللہ کے سوا کوئی بھی (معبود، حاجت روا، فریادرس) نہیں ہے اور فلاح پاجاؤ۔

آخری امت کی بناء پر اس کو جو بنیادی فرض قیامت تک ادا کرتے رہنا ہے" اس کو انجام دینے کا طریقہ (سورۃ فرقان آیت نمبر ۵۱۔۵۲) میں بتادیا گیا ہے" اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ڈرانے والا مبعوث کردیتے (حفاظت الٰہی کی بناء پر قرآن آخری کتاب جو محمد رسول اللہؐ پر نازل ہونے سے وہ خاتم النبین (احزاب ۴۰) ہوئے اور تم ان کی امت ہو۔ اس لیے اہل باطل کی کومت مانو اور قرآن کے ذریعہ ان کے باطل فکر وعقائد کے خلاف مقدور بھر کوشش کرتے رہو۔ اسی لیے نبی کریمؐ نے امت کو تاکید فرمائی ہے کہ مشرکین کے خلاف اپنے مالوں، جانوں اور زبانوں سے جہاد کرتے رہو (ابوداؤد، نسائی) نبی کریمؐ نے ایمان والوں کو مشرکین کے خلاف جہاد کرتے رہنے کی جو ہدایت فرمائی ہے، وہ بے حد اہم ہے کیونکہ اس ہدایت پر عمل کرتے رہنے سے ایک تو مشرکانہ عقائد کی گندگی اور قباحت لوگوں کے علم میں آتی رہے گی، جس سے مشرکانہ عقائد پھیلنے نہ پائیں گے۔ دوسرے لا الہ الا اللہ کی حقیقت واقعہ یعنی خبر کسی کے واسطہ و وسیلہ و طفیل کے بلا کسی رائے مشورہ و سفارش کے تنہا و اکیلا رب ہی اپنی تمام مخلوقات کو ہر آن پرورش، حاجت براری اور مشکل کشائی کررہا ہے کی حقیقت واقعہ علم سے لوگ واقف رہیں گے جو کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے، جس کو تمام پیغمبروں کو سب سے پہلے علم دیا گیا (الانبیاء ۲۵) بلکہ اس حقیقت واقعہ کا ان کو مشاہدہ بھی کروایا گیا (سورہ انعام ۷۵) خصوصی طور پر نبی کریم کو اس حقیقت واقعہ کو ہمیشہ ذہن نشین رکھنے کی نہ صرف تاکید کی گئی بلکہ ان عملی تقاضوں کو بھی بتادیا گیا، جو اس حقیقت واقعہ کی بناء پر کرنا ہے (سورہ محمد ۱۹)۔ ہر نفس کو اس کے اپنے ہی اعمال کا بدلہ لینے اور ابدی عذاب سے بچنے کا طریقہ دنیا میں رب کی اطاعت و فرمانبرداری کا ثبوت اپنے قول و عمل سے دے دینا خیر امت کے فرائض حیات ہیں (ابراہیم ۵،۵۲) فمن یکفرو بالطاغوت ویومن باللہ (بقرہ ۲۵۶) (پس جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے) اور لئن اشرکت لیحبطن عملک (زمر ۶۵) اگر تو شرک کرے گا تو تیرے اعمال غارت ہوجائیں گے)۔ ان اٹل قوانین الٰہی کی رو سے" ایمان کو جب شرک کے اجزاء سے پاک کرنے کی کوشش نہ کی جائے گی (انعام ۸۲) اس وقت تک اللہ پر ایمان صحیح ہوگا اور نہ ہی کوئی عمل قبول ہوگا۔

نثار نامی۔ حیدرآباد

غزل

موجود ہیں دنیا میں کئی ایسے بشر بھی
بے نام ہیں ناکام ہیں یہ برق و شرر بھی

بدلے نہ کبھی میں نے انہیں دیکھ کے تیور
رہتے ہیں ترے ساتھ کئی شوخ نظر بھی

ہوجاتی ہے حالات کی جب ان کو خبر بھی
کس لیتے ہیں فوراً ہی وہاں اپنی کمر بھی

تم ہم کو سناتے ہو کیا اخبار جہاں کا
ہم اپنی خبر رکھتے ہیں دنیا کی خبر بھی

خود اپنے ہی سائے کو بھی اپنا نہ سمجھنا
ہوتے ہیں مخالف یہ کبھی لختِ جگر بھی

پُرخار سبھی رستے ہیں مشکل ہے گزرنا
تم ساتھ اگر دو تو یہ آساں ہے سفر بھی

ہر درد چلا جاتا ہے چھوتے ہی بدن سے
اللہ نے دیا ہاتھ میں میرے وہ اثر بھی

☆☆☆

☆☆

☆

مولانا بدر الحسن القاسمی (کویت)

مولانا محمد محسن صاحب کی وفات کا سانحہ

رب کائنات نے ہر ذی روح کے لئے موت کا فیصلہ ازل سے ہی کر رکھا ہے اب کس کی موت کب؟ کہاں؟ اور کس عمر میں آئیگی اس کا علم خالق کائنات ہی کو ہے البتہ اس کی طرف سے یہ وارننگ سبھوں کے لئے ہے کہ ''کل نفس ذائقة الموت'' ہر کسی کو موت کا مزا چکھنا ہی ہے۔

زندگی مختصر ہو یا لمبی متعینہ مدت کے گزرنے میں دیر نہیں لگتی اسی لئے کہا گیا ہے کہ:

جب سانس کی تعداد گنی ہوئی اور محدود ہے اور اس میں اضافہ کی گنجائش بھی نہیں ہے تو پھر ختم ہونے میں دیر ہی کیا لگے گی۔

یعنی: جب قضا ٹھہری تو کیا سو برس کیا ایک دن؟

ہزار سال جینے والے نوح علیہ السلام نے زندگی کو اس گھر سے تشبیہ دی ہے جس کے دو دروازے ہوں ایک سے آدمی داخل ہو اور دوسرے سے نکل جائے۔

انسانی زندگی کی بے ثباتی کا آج پھر شدت سے مجھے احساس اس لئے ہو رہا ہے کہ میرے قریبی عزیز بچپن کے ساتھی عمر میں مجھ سے دو تین سال بڑے جناب مولانا محمد محسن صاحب (فاضل دیوبند) کا جون کی ۲۴؍ تاریخ کو کچھ عرصہ علیل رہنے کے بعد انتقال ہوگیا۔ اور گاؤں گھر اور علاقہ کے کچھ بہی خواہوں کی موجودگی میں ان کی تدفین عمل میں آئی (إنا لله وإنا إليه راجعون)۔

آدمی زندگی کے کتنے ہی مراحل طے کرلے اور دنیا کے کتنے ہی علاقوں اور ملکوں کی سیر کرلے لیکن اس جگہ کی یاد ذہنوں سے کبھی نہیں نکلتی جہاں اس نے آنکھیں کھولی ہوں اور اس دنیا میں آنے کے بعد اپنی زندگی کے ابتدائی سال گزارے ہوں۔

ایک عرب شاعر کی تعبیر کے مطابق:

بلاد بها حلّ الزمان تمائمي
واول ارض مس جلدي ترابها

(وہ جگہ جہاں میری تعویذیں (بچپن کی علامتیں) کھولی گئیں اور وہ سرزمین جس کی مٹی میرے جسم سے سب سے پہلے لگی)۔

وطن سے رشتہ کے اظہار میں تو کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ اپنے وطن میں لاکھ ظلم وجور کا شکار ہونا پڑا ہو اس کی قدر ومنزلت ذہن میں باقی رہ جاتی ہے۔

بلادي وإن جارت علي عزيزة
وقومي وإن ضنوا عليّ كرام

ہم دونوں کی جائے پیدائش یا حرز بدم در بھنگہ ضلع کے جالہ تھانہ میں واقع گاؤں ریونڈھا ہے جو ان کی دادیہال اور میری نانیہال ہے۔ مولانا مرحوم مجھ سے دو تین سال بڑے تھے لیکن تعلیمی سفر کا آغاز ہم دونوں کا ایک ساتھ ہی ہوا۔

اس کا پہلا مرحلہ تو وہ تھا جب ہم دونوں گاؤں کے مولانا اسرائیل صاحب (اسرار الحق) کے مکتب یا مدرسہ سے وابستہ ہوئے۔ مولانا اسرائیل صاحب بڑے نیک اور صالح انسان تھے اور اپنے شاگردوں کو پڑھانے اور ان کا دینی ذوق ومزاج بنانے میں بے حد مخلص تھے۔

ہم لوگوں کا گھر گاؤں سے باہر ایک ایسے محلّہ میں جو زلزلہ کے بعد گاؤں کی گنجان آبادی سے نکل کر آموں کے باغات، بانس اور کھیتوں کے درمیان واقع ہے، اور وہاں مدرسہ تک جانے کے لئے ڈیڑھ دو کیلو میٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ مدرسہ کے ساتھ ہی پرائمری اسکول کی عمارت بھی تھی بلکہ اس کے صحن کو ہی مدرسہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اس لئے پرائمری تک ہم لوگوں کا نام اسکول میں بھی درج رہا اور اسکول ماسٹروں میں مدّی ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر سلیمان صاحب وغیرہ بھی ہمارے اساتذہ میں ہی شمار ہوتے تھے۔

اردو فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد مولانا اسرائیل صاحب نے ہی ہمارا مستقبل طے کیا اور گاؤں کے بڑے مولانا مولانا فضل الرحمٰن قاسمی صاحب استاذ جامعہ رحمانی کے ذریعہ ہمارے مونگیر جانے اور درس نظامی کی تکمیل کرنے کا پروگرام طے ہوا اور ہم دونوں مونگیر پہنچ گئے، مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی خواہش تھی کہ مجھے معہد ملت مالیگاؤں میں داخل کرادیں لیکن میری کم عمری کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوسکا مونگیر جانے کے ساتھ ہم لوگوں کی کالر والی قمیص ضبط کرلی گئی اور اس کے عوض میں سفید کرتا سلوادیا گیا۔ مونگیر کے داخلہ امتحان میں مجھے عربی سال دوم کے لئے اور مولانا محسن صاحب کو سال اول کے لئے کامیاب قرار دیا گیا، چنانچہ ہم دونوں کا رہن سہن ساتھ لیکن کلاسیں الگ الگ ہوگئیں اور تین سال تک ہماری تعلیم وہاں اچھے معیار پر جاری رہی۔ اس وقت جامعہ رحمانی میں ماہر اساتذہ حضرت مولانا اکرام علی صاحب، مولانا ابواختر صاحب، مولانا حسیب الرحمٰن صاحب، مولانا صغیر احمد صاحب اور مولانا فضل الرحمٰن قاسمی صاحب وغیرہ کا دور دورہ تھا اور امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحب کی سرپرستی، مفتی یحییٰ صاحب بھی اپنی مخصوص وضع قطع اور جلالی مزاج کے ساتھ مدرسہ میں عزت وہیبت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اور بھی کئی اساتذہ تھے۔ جامعہ رحمانی اپنی پرشکوہ عمارت اور مولانا سید منت اللہ رحمانی کی باوقار وپرجلال شخصیت کی وجہ سے خصوصیت اور پورے ملک میں اہمیت وعظمت کا حامل ادارہ سمجھا جاتا تھا۔ اور مولانا کا عزم بھی یہی تھا کہ اس کی مرکزیت میں اضافہ ہو، چنانچہ وہاں دورۂ حدیث کا آغاز بڑے اہتمام کے ساتھ کیا گیا اور حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب وغیرہم کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا اور مولانا اسماعیل سنبھلی صاحب کو بحیثیت شیخ الحدیث متعین کیا گیا، پھر مولانا عبدالستار صاحب اور مولانا شمس الحق صاحب وہاں کے شیخ الحدیث رہے۔ اس کے باوجود ہم لوگوں نے دیوبند جانے کا فیصلہ کرلیا چھوٹے طلبہ ہمیشہ بڑے طلبہ کے نقش قدم پر چلتے ہیں چنانچہ ہم دیوبند پہنچ گئے اور مولانا محسن صاحب بھی ساتھ اور تعلیم کی تکمیل تک ہم دونوں میں ایک سال کا فرق فراغت تک باقی رہا۔

اس زمانہ کا یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ دیوبند کی لائبریری میں چادر اوڑھے ہوئے اپنے لاغر اور نحیف جثہ کیساتھ میں ایک دن پڑھ رہا تھا کہ حضرت امیر شریعت کا جو شوری کے اجلاس میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے وہاں سے گزر ہوا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی فرمانے لگے: ''یہ شکل تو دیکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے؟'' میں نے عرض کیا کہ جی ہاں میں پہلے جامعہ رحمانی میں تھا پھر یہاں آگیا؟

کیوں آگئے؟

صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔

اب ٹھیک رہتی ہے؟

نہیں۔

تو اب کیا قاہرہ وغیرہ جانے کا ارادہ ہے؟

میری زبان سے نکل گیا کہ

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں؟

کہنے لگے اچھا، آپ شام کو مہمان خانہ میں آیئے۔

پھر ساری زندگی بڑی محبت وشفقت کا معاملہ فرماتے رہے۔

ہاں ذکر تو مولانا محسن صاحب کا ہی تھا کہ ہم دونوں نے طالب علمی ایک ساتھ شروع کی تھی اور برسوں ساتھ رہے۔ میری فراغت ایک سال پہلے ہوئی اور میں دارالافتاء سے وابستہ ہو کر حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ سے فتوی نویسی کی مشق میں لگ گیا اور وہ فراغت کے بعد وطن لوٹ آئے اور زندگی کی دوڑ اور ملازمت کی تلاش میں لگ گئے کئی شہروں میں رہے اور کئی مدرسوں سے مدرس کی حیثیت سے وابستہ رہے پھر سستی پور سے قریب رامپور کا مدرسہ ضیاء العلوم ان کو اتنا راس آیا کہ وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے اور ۱۹۸۷ء سے وفات تک کا طویل عرصہ انہوں نے وہیں گزار دیا اس عرصہ میں مدرسہ اور اس کے ذمہ داروں سے ان کو اور ان سے مدرسہ کے ذمہ داروں کو بھرپور مناسبت رہی اور کبھی شکوہ وشکایت کی بات نہیں سنی گئی۔ یہ ان کی استقامت کی اور مستقل مزاج ہونے کی بھی علامت ہے کہ دینی علوم کی خدمت کی جو راہ اللہ نے کھول دی ہے اس پر قناعت کر لی جائے۔ اور یہ بات جبھی پیدا ہو سکتی ہے کہ آدمی کا اس بات پر پختہ یقین ہو کہ اللہ تعالی نے جتنی روزی مقرر کر دی ہے وہ تو بہر صورت مل کر رہے گی اور ایک جگہ سکون سے کام کرنے کی اللہ نے سہولت فراہم کر دی ہے تو در در کی ٹھوکریں کھانے کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔

مولانا محسن صاحب نے اپنی صلاحیت کے بقدر تدریس کے ساتھ وعظ وتبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور گاؤں اور علاقہ کی ضرورت اور لوگوں کی خواہش کے مطابق جلسے جلوس میں بھی شرکت کرتے رہے اور عوام میں دینی ذوق ومزاج پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

مولانا محسن صاحب کی یہ بات بھی قابل تعریف بلکہ قابل تقلید ہے کہ وہ پرسکون زندگی کے عادی تھے اور گھر کے لوگوں میں بھی اسی مزاج کو عام اور رائج کرنا چاہتے تھے چنانچہ وہ گاؤں یا محلّہ کے کسی جھگڑے اور لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والی چھوٹی اور معمولی باتوں پر آویزش سے وہ ہمیشہ دور رہے اور اپنے بال بچوں کو بھی دور رکھا اور اپنے کام سے کام رکھنے کا سبھوں میں مزاج بنایا جو اس زمانہ میں ناپید ہے اور عام طور پر لوگ غیر ضروری اختلافات میں اپنی طاقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔ مولانا محسن صاحب اس طرح کی باتوں سے ہمیشہ خود کو دور رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔

مولانا محسن صاحب کی وفات سے گاؤں اور علاقہ ایک خاموش طبع اور بے ضرر عالم دین سے محروم ہو گیا ہے اور یہ حادثہ میرے لئے ذاتی غم اور صدمہ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ان کی حیثیت قریبی عزیز ہونے کے ساتھ ہمدم دیرینہ بچپن کے ساتھی اور بڑے بھائی کی بھی تھی، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ان کو فردوس بریں میں جگہ دے اور ان کو اپنی خصوصی رحمت ومغفرت سے نوازے اور بال بچوں کو صبر وشکیب عطا فرمائے۔ آمین

حسین کیرانہ اسٹور ہول سیل اینڈ ریٹیل
H.K. Caterers
مین روڈ میر عالم منڈی حیدرآباد

Mohammed Abdul Khader
Cell : 9392492002
: 9885959976
HUSSAIN
KIRANA STORE
WHOLESALE & RETAIL
Specialist in : All Kinds of Catering Suppliers
22-3-480/482, Clock Tower Main Road,

ابو ہریرہ ایوبی ۔ زیدہ پور، بارہ بنکی (یوپی)

میلبورن میں ٹیم انڈیا نے مارا میدان

نئے سال پر ٹیم انڈیا نے ملک کو بہترین تحفہ دیا۔ میلبورن ٹیسٹ میں ٹیم انڈیا نے کنگاروں کو چاروں خانے چت کر دیا۔ میلبورن کے میدان پر ملی جیت ٹیم انڈیا کے لئے کئی معنوں میں اہم ہے۔ ایک طرف جہاں ٹیم انڈیا نے چار میچوں کی سیریز میں دو ایک کی برتری حاصل کرلی ہے۔ وہیں اب سیریز پر قبضہ کرنے اور کنگاروؤں کو ان کی ہی سرزمین پر پٹخنے کا بھی ٹیم انڈیا کے پاس سنہرا موقع ہے۔ میلبرن ٹیسٹ اتار چڑھاؤ سے پُر رہا۔ پہلی اننگز میں جہاں ٹیم انڈیا نے 443 رنوں پر اپنی باری ڈکلیئر کردی۔ تو وہیں میزبان آسٹریلیائی ٹیم جسپریت بمراہ کی خطرناک گیندبازی کے آگے محض 151 رنوں پر ڈھیر ہوگئی۔ بمراہ نے میلبورن کے میدان پر تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ بمراہ نے 15 اوور اور پانچ گیندوں میں تینتیس رن کے عوض چھ قیمتی وکٹ حاصل کئے۔ اور اس طرح ٹیم انڈیا کو پہلی اننگز کی بنیاد پر بڑی بڑھت ملی۔ حالاں کہ ٹیم انڈیا نے میزبان کو فالوآن نہ دیکر اپنی دوسری اننگز کی شروعات کی۔ لیکن اس بار ٹیم انڈیا شروع سے ہی لڑکھڑا گئی۔ اور سو رنوں تک ٹیم انڈیا نے آٹھ وکٹ گنوا دیئے۔ کپتان کوہلی اور پجارا صفر پر آؤٹ ہوگئے۔ ٹیم انڈیا نے اپنی دوسری اننگز بھی 106 رنوں پر ڈکلیئر کردی۔ اس طرح پہلی اور دوسری اننگز کو ملا کر ٹیم انڈیا نے میزبان ٹیم کے سامنے ایک بڑا ہدف رکھا۔ ٹیسٹ کے چوتھے دن جب آسٹریلیائی ٹیم نے اپنی دوسری باری کی شروعات کی اس وقت میزبان کے پاس وقت بہت تھا۔ لیکن ٹیسٹ کے چوتھے روز پچ بلے بازی کے لئے سازگار نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کنگاروؤں کی دوسری اننگز میں شروعات اچھی نہیں رہی۔ سلامی بلے باز سستے میں پویلین لوٹ گئے۔ مارش اور پیٹ کمنز نے کچھ حد تک ٹیم کو بڑی شکست سے بچانے کی کوشش کی۔ تو کچھ راحت موسم نے بھی دی۔ لیکن میلبورن کے میدان پر اس بار کنگاروؤں کی شکست لکھی جا چکی تھی۔ ٹیسٹ کے پانچویں روز لنچ کے بعد جیسے ہی کھیل شروع ہوا۔ ٹیم انڈیا کے گیندبازوں نے حملہ کر میچ ٹیم انڈیا کی جھولی میں ڈال دیا۔ اس طرح ٹیم انڈیا نے میلبرن ٹیسٹ 137 رنوں سے جیت لیا۔ دوسری اننگز میں بھی بمراہ نے تین اہم وکٹ چٹکائے۔ کل ملا کر میلبورن ٹیسٹ میں بمراہ نے نو اہم وکٹ لیئے۔ اور مین آف دا میچ بنے۔ اس طرح چار میچوں کی سیریز میں ٹیم انڈیا نے دو ایک کی برتری حاصل کر لی۔۔۔ میلبورن کے میدان پر ملی اس شاندار جیت سے کوہلی اینڈ کمپنی کے حوصلے بلند ہیں۔ اب اگر ٹیم انڈیا۔ آسٹریلیائی میدان پر یہ سیریز اپنے نام کرلیتی ہے۔ تو یہ اپنے آپ میں تاریخی کارنامہ ہوگا۔ اور ٹیم انڈیا پر لگا گھر کا شیر والا ٹیگ بھی ہٹے گا۔ حالاں کہ آسٹریلیائی ٹیم بھلے ہی پیپر پر کمزور ہو، لیکن اپنی سرزمین پر کنگارو ہمیشہ ہی ببر رہے ہیں۔ اس شکست کے بعد جہاں ٹیم انڈیا کا عالمی پیمانے پر دبدبہ قائم ہوا ہے۔ تو وہیں آسٹریلیا کی بادشاہت اور ان کی طاقت کا گراف گرا ہے۔ باکسنگ ڈے ٹیسٹ میں یہ ٹیم انڈیا کی پہلی جیت ہے۔ خیر۔ اس تاریخی جیت میں ٹیم انڈیا کے لئے جشن منانے کے کئی مواقع ہیں۔ کیوں کہ اس جیت کے ساتھ ہی ٹیم انڈیا نے ٹیسٹ میچوں میں 150 ویں فتح حاصل کی ہے۔ اب تک ٹیم انڈیا نے کل

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد (ملک پیٹ)

لڑکیوں کی اعلیٰ دینی وعصری تعلیم کا فکری واصلاحی معیاری مرکز

شعبہ جات: تحفیظ القرآن الکریم ★ شعبہ ابتدائیہ (دوسال) ★ شعبہ عالمیت (چارسال) ★ شعبہ فضیلت (دوسال)

☆شہر سے اہم مقامات سے آمدورفت کی سہولت ☆دور دراز کی طالبات کے لیے ہاسٹل کا نظم ☆عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک تا ایم۔اے امتحانات دلوانے کا نظم

لڑکیوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، سیرت، تاریخ کے علاوہ انگریزی زبان کے اعدادیہ تا فضیلت چھ سال تعلیم کا بہترین نظم ہے

رابطے کے لیے پتہ:

JAMIATUL BANAT AL-ISLAHIYAH
#16-3-993/1, NEAR DAWN HIGH SCOOL
OFFICERS COLONY, NEW MALAKPET,
HYDERABAD(T.S) INDIA 500036

نصب العین: انقلاب بذریعہ تعلیم قرآن وسنت کی گہری بصیرت، شہادت حق، احیائے دین کی استعداد اور امت کے لیے داعیانہ، مجاہدانہ اور قائدانہ کردار کی حامل "المرأۃ الصالحۃ" ٹیم کی تیاری۔

☆شعبہ تحفیظ القرآن اور شعبہ ابتدائیہ وعالمیت کے پہلے سال میں داخلے سال بھر جاری رہیں گے۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے خواہشمند سرپرست حضرات سے اپنی لڑکیوں کے ہمراہ جلد رجوع ہونے کی خواہش کی جاتی ہے۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد کا استحکام وقت کا اہم تقاضہ اور ملی فریضہ ہے۔ اس اہم مرکز کی تعمیر وترقی ک لیے مالی اور اخلاقی تعاون فرما کر ہمارے حوصلے کو قائم رکھیں۔

ناظم: مولانا عبدالعلیم اصلاحی
موبائل 9676202819

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ حیدرآباد

کی جانب سے ماہنامہ "صدائے شبلی" کے قارئین اور اہل وطن کو

یومِ جمہوریہ ہند

کی پرخلوص مبارکباد

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی (چیرمین)
ڈاکٹر عبدالقدوس
ڈاکٹر سراج احمد انصاری
ڈاکٹر محمد رفیق
ڈاکٹر مختار احمد فردین
ڈاکٹر حمران احمد

ڈاکٹر غوثیہ بانو
ڈاکٹر سمیہ تمکین
ڈاکٹر شاہانہ مریم شان
ثمینہ یاسمین
مولانا مساعد ہلال
مولانا محمد وقار حسامی
ابوہریرہ یوسفی

532 ٹیسٹ میچز کھیلے ہیں۔ جن میں 165 ٹیسٹ میں شکست کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اور 216 ٹیسٹ بے نتیجہ رہے۔ یہ جیت کپتان کوہلی کے لئے بھی بہت اہم ہے۔ بطور کپتان وراٹ کوہلی نے غیر ملکی سرزمین پر سابق کپتان سورو گانگولی کی برابری بھی کرلی ہے۔ یہ وراٹ کی غیر ملکی سرزمین پر 11 ویں جیت ہے۔ اتنے ہی ٹیسٹ گانگولی نے بھی اپنی قیادت میں جیتے تھے۔ یہاں تک ٹیسٹ کریئر میں ٹیم انڈیا کا سفر شاندار رہا ہے۔ اور ایسے موقع پر ٹیم انڈیا نے یہ جیت حاصل کی ہے جب ملک نئے سال کے جشن میں ڈوبا ہوا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ نئے سال پر ٹیم انڈیا ملک کے عوام کو اس سے اچھا تحفہ نہیں دے سکتی تھی۔

جذباتِ نامی

(شعری مجموعہ)

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا، اس لئے مصنفین، مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دوعدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

تبصرہ نگار: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نام کتاب:	جذباتِ نامی (شعری مجموعہ)
مصنف:	نثار نامی
صفحات:	160
قیمت:	200/-
ملنے کا پتہ:	اردو بک ڈپو انجمن ترقی اردو۔ گلشن حبیب اردو ہال حمایت نگر حیدرآباد

اردو شعروادب کی بنیاد حیدرآباد سے شعری شاخیں مختلف فکروفن میں قلی قطب شاہی دور سے برابر نکلتی آرہی ہیں۔ انہیں میں ایک اہم نام سید نثار علی نامی کا ہے۔ موصوف استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی کے شاگردوں کے جم غفیر میں ایک ہیں، وہ صوفی اور عامل بھی ہیں۔

زیرنظر مجموعہ ''جذبات نامی'' یہ ان کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کے انتساب میں ان کی فکری بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔

انتساب: میری والدہ جن کے قدموں میں میری جنت ہے۔ میرے والد جو میری جنت کا دروازہ ہیں۔

جذبات نامی مناجات سے شروع ہوتی ہے، آخری شعر میں وہ کہتے ہیں ؎

نامی کو تو بنادے خُلدِ بریں کے لائق
جانا کدھر ہے یارب تو راستہ بتادے

صراطِ مستقیم کے متمنی اور جنت کے مشتاق ہیں، اللہ سے اسی بارے میں مناجات کررہے ہیں۔ مناجات کے بعد واحد

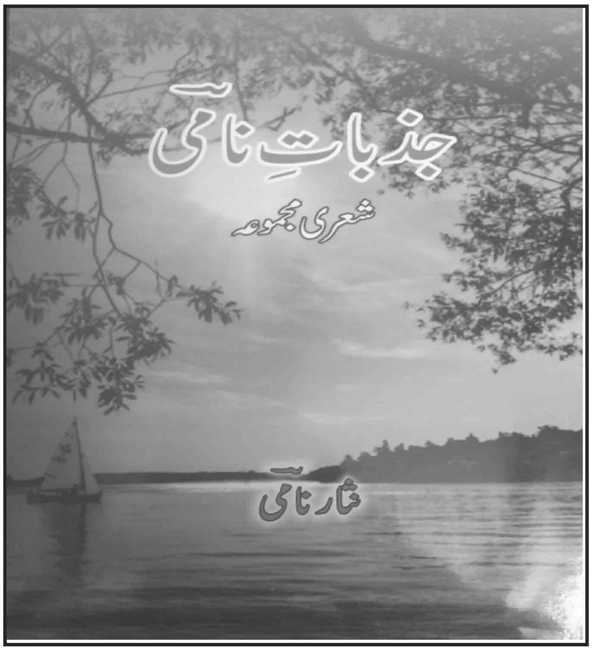

نعت پاک ہے، جس میں محبتِ رسولؐ، عظمتِ رسولؐ اور اطاعتِ رسولؐ کا احساس ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

اللہ بھی وہی فرماتا ہے جو بات نبی فرماتے ہیں
جملوں میں رسولِ اکرمؐ کے قرآن کی آیت ہوتی ہے

رب العلمین اور رحمۃ للعلمین کے بعد انہوں نے مقصدِ کائنات اور مشنِ رسولؐ کو قائم کرنے کے لیے صنفِ غزل کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کیا، کیوں کہ صنف غزل اپنے اندر بڑی وسعت رکھتی ہے۔

انہوں نے ملک کے سیاسی، سماجی، خارجی، داخلی، قومی، یکجہتی پر بڑی ہی سادگی سے شاعری میں پرُکاری کی ہے۔ ان کی شاعری پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے مشکل تراکیب کا استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ انہوں نے شاعری کیوں کی ہے ؎

وہ کیا سمجھیں گے اس کو نثار نامی
آواز میرے دل کی یہ میری شاعری ہے

ان کی شاعری رطب ویابس سے پاک اور صرف ان کے دل کی آواز ہے اور شاعری کی دنیا میں قدم رکھنے کو وہ اپنے کو خوش نصیب سمجھتے ہیں ۔

تو، تو قسمت کا دھنی نامی
تیرے حصے میں شاعری آئی

گذشتہ سال بی جے پی حکومت کے نوٹ بندی کے غیر دانشمندانہ فیصلے سے لوگ پریشان ہوگئے تھے، اسی پریشانی کی انہوں نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ نشاندہی بھی کی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ۔

لاکھوں کی زندگی کو مصیبت میں ڈال کر
بیٹھا ہے مسکراتا حکومت سنبھال کر

نامی صاحب کو اردو سے بڑی محبت ہے، کیونکہ اس میں آباواجداد کا تہذیبی ورثہ پوشیدہ ہے، جس کو چھوڑ کر ہمارا نوجوان پیاسا ہے۔ کہتے ہیں ۔

اردو سے ناطہ توڑ کے ملت کے نوجواں
اپنی زباں سے رہتے ہیں تشنہ زمین پر
اردو معاشرے سے ہمارے گئی ہے یوں
تہذیب ہی ہمارے گھروں سے نکل گئی

اردو کے تعلق سے ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اردو کو کوئی مٹا نہیں سکتا ہے ۔

مجھے تم مٹانے کی کوشش نہ کرنا
میں مٹ کر بھی زندہ ہوں اور اردو زباں ہوں

نامی صاحب کی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر جگہ حقیقت بیانی کی ہے، ان کے کلام میں موضوعاتی تنوع اور طرز ادا کی جدت و شیرینی ہے۔ ان کی شاعری میں ماضی کا کرب، حال کی کشمکش اور مستقبل کو کامیاب بنانے کی کیفیات کا اظہار ہے۔ عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کی غمازی جگہ جگہ نظر آتی ہے، جس سے صوفیانہ اور شوقیانہ احساس ہوتا ہے، ان کی شاعری میں فکروفن کی کئی طرح کی جولانیاں نظر آتی ہیں، جو اردو شاعری میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ راقم الحروف انہیں صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہے اور پرامید ہے کہ آپ کا شعری سلسلہ جاری رہے گا ۔

یوں ہی پہنچا نہیں بلندی پر
تیری رحمت مجھے یہاں لائی

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowki Hyderabad - 500008 T.S India